اکتوبر ۱۹۹۲ء

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
مطالعہ قرآنِ حکیم (سورۃ الانفال آیات ۲ تا ۴)	ڈاکٹر اسرار احمد	۳
اسلام اور طبِّ نفسیات	پروفیسر ڈاکٹر محمد شریف چوہدری	۹
حکمتِ اقبال (۴۴)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۱۶
شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ (۳)	عبدالرشید عراقی	۲۵
لغات و اعراب قرآن (۳۸)	پروفیسر حافظ احمد یار	۳۱
عورت کے حقوق و فرائض اور دائرہ کار	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	۴۹
حقوقِ انسانی: قرآن و حدیث کی روشنی میں (۴)	سید شبیر حسین زاہد	۵۶
تبصرہ کتب	محمد سعید الرحمٰن علوی	۶۲

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیمِ اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں عملی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت

رجوع اِلیٰ القرآن

کا منظر و پس منظر

چھپ کر آ گئی ہے ــــ ضرور مطالعہ کیجئے ــــ دُوسروں تک پہنچایئے۔

■ سفید کاغذ ■ عمدہ کتابت ■ دیدہ زیب طباعت ■ قیمت مجلّد -/۶۵ روپے ■ غیر مجلّد -/۵۰

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ
خَيْرًا كَثِيْرًا
(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ لاہور

حِکمتِ قرآن

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدّین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم
مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،
معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)
ادارۂ تحریر
پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

شمارہ ۱۰
اکتوبر ۱۹۹۲ء ـ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
جلد ۱۱

—— یکے از مطبوعات ——
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۸۵۶۰۰۳
کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بخاری، شاہراہ لیاقت کراچی فون ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون ۴۰/- روپے، فی شمارہ ۴/- روپے
مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف اول

خط وکتابت کورس

اکثر قارئین اس امر سے واقف ہیں کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے تعلیم و تعلمِ قرآن کے ضمن میں جہاں قرآن کالج اور ایک سالہ دینی کورس کا اجراء کیا وہاں اس تعلیمی عمل کو وسعت دینے کے لئے خط وکتابت کورس بھی رفقاء واحباب میں متعارف کرایا۔ پیش نظر یہ تھا کہ وہ احباب جو دینی تعلیم کے حصول کی خاطر ایک سال کے لئے اپنے آپ کو کُل وقتی بنیادوں پر فارغ نہ کر سکتے ہوں' **ما لا یُدرَکُ کلّہ لا یُترَکُ کلّہ**" کے اصول کے تحت بالکل محروم نہ رہیں بلکہ خط وکتابت کورس کے ذریعے کچھ نہ کچھ دینی تعلیم ضرور حاصل کرلیں۔ اسطرح کے کورس میں چونکہ اوقات کی کوئی ایسی قید نہیں ہوتی کہ انسان لازماً دن کا کوئی ایک معین حصہ اس کے لئے مقرر کرے بلکہ اپنی سہولت کے مطابق اوقات کو آگے پیچھے بھی کیا جا سکتا ہے بلکہ انتہائی مصروفیت کی صورت میں اسے کچھ عرصے کے لئے موقوف بھی کیا جا سکتا ہے لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ دینی علم کے حصول کا یہ سہل ترین طریق ہے ' تو قطعاً غلط نہ ہوگا۔ تاہم ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ طریق تعلیم اتنا مؤثر نہیں ہے جتنا کہ ایک سال دینی تعلیم کے لئے فارغ کر کے اور باقاعدہ قرآن کالج میں داخلہ لے کر ہمہ تن حصولِ علم کی جانب متوجہ ہو جانا! ----- لیکن جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا' خط وکتابت کورس' اصلاً ہے ہی ان حضرات کے لئے جن کے لئے کسی طور پر بھی ایک سالہ کورس کے لئے وقت نکالنا ممکن نہ ہو! ---- ایسے حضرات کو بہرصورت اس کورس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے اور اگر اب تک اس جانب توجہ نہیں ہوئی تھی تو مزید وقت ضائع کئے بغیر فی الفور اس کورس میں شمولیت اختیار کرلینی چاہئے۔

فی الوقت اس شعبے کے تحت دو خط وکتابت کورس چل رہے ہیں۔ ایک کورس کا عنوان ہے : "قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی" --- یہ کورس بنیادی طور پر محترم

(باقی صفحہ ۸ پر)

مطالعۂ قرآن حکیم
ڈاکٹر اسرار احمد

سورۃ الانفال

(آیات ۲-۴)

اَحْمَدُہٗ وَاُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ۔ اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْہِمْ
اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ
الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط
لَھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَمَغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ ۝

"مومن تو بس وہی ہیں جن کے دل اللہ کے ذکر پر لرز اُٹھتے ہیں اور جب اُس کی آیتیں انہیں سنائی جاتی ہیں تو اُن کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ صرف اپنے ربّ پر ہی توکّل کرتے ہیں۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں بھی) خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ حقیقۃً مومن ہیں۔ ان کے لیے محفوظ ہیں ان کے رب کے پاس اعلیٰ درجے بھی اور عفو و درگزر بھی اور باعزّت روزی بھی!"

سورۃ الانفال کی پہلی آیت کا اختتام "اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ" کے الفاظ مبارکہ پر ہوا تھا یعنی جو احکام تمہیں دیئے گئے ہیں ان کی تعمیل ہی تمہارے زیادہ مناسبِ حال ہے' اگر تم فی الواقع مومن ہو۔ اسی مناسبت سے اگلی تین آیات میں' جن کا ترجمہ ابھی پیش کیا گیا، ایمانِ حقیقی کے بعض دوسرے ثمرات و مضمرات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کے معانی و مفاہیم پر غور کرنے سے پہلے اس موضوع کی اہمیّت کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

ایمان اصلاً ایک خاص باطنی و قلبی کیفیت کا نام ہے جو بعض اُمور پر یقین کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، یعنی اللہ کے وجود، اس کی توحید اور اس کی صفاتِ کمال، بعث بعد الموت، حشر و نشر، جزا و سزا اور جنّت و دوزخ، اور ملائکہ، وحی، نبوت و رسالت اور کتبِ الٰہی پر یقین کا حاصل جمع اور ان سب کا لبِّ لُباب ایمان ہے، لیکن یہ یقین ایک باطنی اور قلبی کیفیت ہے جس کے عدم و وجود کے فیصلے یا ناپ تول اور درجہ بندی کا کوئی ذریعہ انسان کے پاس موجود نہیں ہے۔ ان تمام امور کے حتمی اور یقینی فیصلے تو آخرت ہی میں اللہ تعالیٰ کے علمِ کامل کی بنیاد پر ہوں گے۔ لیکن دوسری طرف اسلام صرف ایک اخلاقی یا روحانی تعلیم کا نام نہیں ہے بلکہ تہذیب و تمدّن اور حکومت و ریاست کے جملہ معاملات کو بھی اپنے حیطۂ اقتدار میں لینا چاہتا ہے۔ لہٰذا فطری طور پر اس کی ضرورت ہے کہ دنیا میں بھی اس کا فیصلہ کیا جاتے کہ کون مومن ہے کون نہیں، یعنی کون مسلم معاشرے میں شریک اور اسلامی ریاست کا کامل شہری قرار پا سکتا ہے اور کون نہیں۔ چنانچہ دنیا میں اس فیصلے کو بعض ایسے اُمور پر مترتّب فرما دیا گیا جو خارجی اور ظاہری ہیں اور جن پر اس دنیا میں حکم لگایا جا سکتا ہے، یعنی زبان سے اِن اُمورِ ایمانیہ کا اقرار اور کلمۂ شہادت کی ادائیگی اور نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی پابندی۔ اور ان اُمورِ خمسہ کو ارکانِ اسلام قرار دے کر اسلامی معاشرے اور ریاست کی اساس و بنیاد قرار دے دیا گیا۔ اور اس کے لیے اگرچہ "اسلام" کی جُداگانہ اصطلاح بھی وضع فرما دی گئی لیکن دنیا کی حد تک اسے "ایمان" بھی قرار دے دیا گیا۔ اگرچہ زیادہ معیّن الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ قانونی یا شرعی و فقہی ایمان ہے۔ اس طرح اگرچہ بات اپنی جگہ تو مکمّل ہو گئی لیکن ایک ضرورت باقی رہی، اور وہ یہ کہ جو لوگ اس قانونی ایمان کے دائرے میں آ جائیں انہیں مسلسل تربیت دی جاتی رہے کہ اس مقام پر اکتفا نہ کر لیں بلکہ آگے بڑھ کر حقیقتِ ایمان تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اپنے قلوب و اذہان سمیت اپنی پوری شخصیت کو نورِ ایمان سے منوّر کرنے کی سعیِ پیہم میں مصروف رہیں۔ اس غرض کے لیے کہیں تو انداز و اسلوب وہ اختیار کیا گیا جو سورۃ النساء کی آیت ۱۳۶ میں ملتا ہے، یعنی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ۔

"اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی!"

اور کہیں وہ اسلوب اختیار کیا گیا جو سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ میں ہے، یعنی:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا
يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ ؕ

”یہ بدّو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ اے نبیؐ! ان سے کہیے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو، بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا!“

غرضیکہ قرآن بار بار متنبہ کرتا ہے کہ قانونی ایمان یا اسلام اور ہے اور حقیقی ایمان اور بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن   ملّا کی اذاں اور، مجاھد کی اذاں اور

قانونی ایمان یا اسلام اِس دُنیا میں اسلامی معاشرے اور ریاست کی بنیاد اور اساس ہے جبکہ آخرت کے معاملات کا معیارِ واحد حقیقی ایمان ہے۔ اس پورے معاملے کے منطقی نتیجے کے طور پر یہ ضرورت بھی سامنے آتی ہے کہ اُس مطلوب ایمانِ حقیقی کی جامع و مانع تعریف بھی بیان کی جائے اور اُس کے ثمرات و مضمرات کو بھی کھول کر بیان کیا جاتا رہے تاکہ اہلِ ایمان ان کی کسوٹی پر اپنے آپ کو پرکھتے رہیں اور اس کا ایک معیار ہمیشہ اُن کے پیشِ نظر رہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں تو جامع و مانع تعریف بیان کر دی، اس لیے کہ وہی موقع اس کے لیے سب سے زیادہ مناسب تھا اور دوسرے بہت سے مقامات پر ایمانِ حقیقی کے مختلف آثار و نتائج اور ثمرات و مضمرات کو کھول کھول کر بیان کر دیا۔ جیسے سورۃ التغابُن کا دوسرا رکوع جو اس ضمن میں اگر قرآنِ حکیم کا جامع ترین مقام نہیں تو کم از کم جامع مقامات میں سے ایک ضرور ہے۔ ایسے ہی مقامات میں سے ایک آج کی زیرِ درس آیات پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں ایمانِ حقیقی کے پانچ لوازم یا ثمرات بیان ہوئے ہیں:

اوّلاً یہ کیفیت کہ جہاں اللہ کا نام آئے اور جب بھی اس کا ذکر ہو اصحابِ ایمان کے قلوب میں گداز پیدا ہو جائے اور اُن پر رقّت طاری ہو جائے۔ یہ کیفیت خشیتِ الٰہی اور محاسبۂ اُخروی کے خوف کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے اور عشق و محبتِ الٰہی کا ثمرہ بھی! لیکن بہرصورت یہ ہے ایمانِ حقیقی کا نتیجۂ لازمی۔ اس کے فقدان ہی کی صورت ہے جسے قساوتِ قلبی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کی آخری حد وہ ہے جسے یہود کے ذکر میں سورۃ البقرہ کی آیت ۷۴ میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا کہ: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ (یعنی پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہوتے چلے گئے اور اب وہ پتھروں کے مانند ہو گئے ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ سخت!) اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجامِ بد سے

اپنی پناہ میں رکھے!

ثانیاً یہ کہ جب اللہ کی آیات سُنائی جائیں تو اُس سے اہلِ ایمان کو اپنے جذباتِ ایمانی میں جلااور کیفیاتِ ایمانی کی شدّت میں اضافہ ہوتا محسوس ہو۔ اِس لیے کہ قرآنِ حکیم منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین ہے۔ اس کے پڑھنے اور سننے سے ایمان میں لازماً اضافہ ہونا چاہیے، جیسے کہ ایک جلتی بھٹّی کے سامنے بیٹھنے سے حرارت کا احساس لازمی ہے اور اگر کسی شئے میں حرارت سرایت نہیں کرتی تو یہ ثبوت ہے اس کا کہ اس میں حرارت کو جذب کرنے کی صلاحیت ہی موجود نہیں۔ اسی طرح اگر قرآنِ حکیم کے پڑھنے یا سننے سے کسی کے ایمان میں اضافہ نہیں ہوتا تو یہ قطعی ثبوت ہے اس کا کہ اس کے دل میں ایمانِ حقیقی سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

ثالثاً یہ کہ بندۂ مومن کا توکّل و اعتماد صرف ذاتِ خداوندی پر ہو، اس لیے کہ توحید کا حاصل یہ ہے کہ فاعلِ حقیقی اللہ کے سوا اور کوئی نہیں، بقول حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ: لَا فَاعِلَ فِي الْحَقِيْقَةِ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰهُ! اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور چیز پر بھروسہ نہ رہے اور اس کی ذاتِ واحد کے سوا کسی اور سے رشتۂ بیم و رجا قائم نہ رہے، بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

بُتوں سے تجھ کو اُمیدیں، خدا سے نَومیدی   مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

جب تک انسان کو یہ یقین نہ ہو کہ کسی سبب یا علّت یا ذریعے یا وسیلے میں یہ قوّت نہیں کہ وہ اللہ کے اِذن کے بغیر کوئی نتیجہ پیدا کر سکے۔ اور دوسری جانب اللہ کسی سبب یا ذریعے یا وسیلے کا محتاج نہیں کہ اس کے بغیر اپنے کسی ارادے کو پورا نہ کر سکے، اس وقت تک ایمان باللہ ہی درست نہیں ہوتا، اور ان دونوں باتوں کا حاصل ایک ہی ہے، یعنی بھروسہ اور اعتماد اور توکّل اور تکیہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ پر ہو اور غیر اللہ سے ان تمام رشتوں کا انقطاع ہو جائے۔

رابعاً۔ اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز کی پابندی، اس کے جملہ شرائط و آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ اس لیے کہ عشق و محبت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محبوب کے ذکر سے لذّت حاصل ہو اور اس سے مخاطبہ و مکالمہ ہی میں دل کو اصل راحت نصیب ہو، اور محبّتِ الٰہی لازمی ثمرہ ہے ایمان باللہ کا، بلفواے الفاظِ قرآنی: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط (یعنی جو لوگ واقعۃً حلاوتِ ایمانی کی لذّت آشنا ہوتے ہیں اُن کو سب سے بڑھ کر محبّت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے!) لہٰذا وہ تو بے چین رہتے ہیں کہ کب اِذنِ نماز یعنی اذان کی آواز کان میں پڑے

اور وہ ہمہ تن ذکرِ الٰہی کی جانب متوجہ ہو جائیں۔

خامساً۔ انفاق فی سبیل اللہ یعنی جو کچھ اللہ نے عطا فرمایا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں مسلسل خرچ کرتے رہنا۔ یہ بھی لازمی اور منطقی نتیجہ ہے ایمانِ حقیقی کا۔ بلکہ اس ضمن میں ایمان کا اصل تقاضا تو یہ ہے کہ

"جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!"

کے مصداق سب کچھ اللہ کی راہ میں لُٹا دیا جائے۔ یہ تو دراصل اللہ ہی کے حکم کی تعمیل میں ہے کہ بندۂ مومن اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر بھی صرف کرے، ورنہ اس کی اصل خوشی انفاق فی سبیل اللہ میں ہے!!

ان آخری دو ثمراتِ ایمانی کے لیے جو الفاظ یہاں مستعمل ہوئے ان سے بھی سورۃ البقرہ اور سورۃ الانفال کا ایک قریبی تعلق سامنے آتا ہے، اس لیے کہ سورۃ البقرہ کے آغاز میں بھی بعینہٖ یہی الفاظ وارد ہوئے ہیں!

اس مقام پر تدبرِ قرآن کے اعتبار سے ایک نکتہ بہت اہم ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ کے آخر میں آخری سے پہلی (LAST BUT ONE) آیت میں الفاظ وارد ہوئے ہیں:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ
اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ
وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝

"اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ ہیں حقیقی مومن، ان کے لیے مغفرت بھی ہے اور باعزت روزی بھی!"

اس سے ایمانِ حقیقی کی تصویر کا دوسرا رُخ کاملۃً سامنے آ جاتا ہے، یعنی ہجرت و نصرت اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ، جو ایمانِ حقیقی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر سورۃ الانفال کے آغاز و اختتام کے اِن دونوں مقامات کو جمع کر لیا جاتے تو ایمان کے ثمرات و مضمرات اور آثار و نتائج کے یہ دونوں رُخ مل کر ایمان کی جامع و مانع تعریف کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی ہے وہ مضمون جو سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں وارد ہوا جس کی جانب اشارہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ وہاں آیت ۱۴ میں، جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے، ایمان اور اسلام کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ گویا وہ موزوں ترین مقام ہے ایمان کی جامع و مانع تعریف کا جو ان الفاظ میں وارد ہوئی کہ:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا
وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝

"حقیقی مومن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائیں اللہ اور اُس کے رسول پر، پھر شک میں نہ پڑیں اور جہاد کریں اللہ کی راہ میں اور کھپائیں اس میں اپنی جانیں بھی اور اپنے مال بھی۔ (دعوائے ایمان میں) سچے صرف وہی ہیں!"

آیات زیرِ درس میں ایمانِ حقیقی کے اجر و ثواب کی قطعیّت و حتمیّت، درجات و مراتبِ عالیہ کے پختہ وعدے اور رزقِ کریم کی نوید جانفزا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایمانِ حقیقی کی دولتِ بے بہا سے نوازے اور ان وعدوں کا مصداق بنائے! ـــــ اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ اِلَيْنَا الْاِيْمَانَ وَزَيِّنْهُ فِيْ قُلُوْبِنَا وَكَرِّهْ اِلَيْنَا الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ وَاجْعَلْنَا مِنَ الرَّاشِدِيْنَ۔
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

بقیہ: ' حرفِ اوّل '

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے مرتب کردہ منتخب نصاب کے قرآنی دروس پر مشتمل ہے جس کے ذریعے دین کا ایک جامع خاکہ بھی واضح ہوتا ہے اور دینی ذمہ داریوں کا بھی صحیح تصوّر اجاگر ہوتا ہے ـــــ دوسرا کورس عربی گرامر کی تدریس سے متعلق ہے۔ قرآن حکیم کو بلا کسی ترجمے کے واسطے کے براہ راست سمجھنے کے لئے عربی زبان کی تحصیل ضروری ہے اور عربی زبان سیکھنے کے لئے گرامر کے بنیادی قواعد کا جاننا ناگزیر ہے۔

جو حضرات بھی ان کورسز میں شرکت کے خواہاں ہوں وہ کورس کے پراسپکٹس ، داخلہ فارم اور دیگر تفصیلات شعبۂ خط و کتابت کورس ، قرآن کالج ۱۹۱۔ اتاترک بلاک ، نیو گارڈن ٹاؤن سے طلب فرمائیں اور اللہ کا نام لے کر اس تعلیمی کورس کا آغاز کر دیں۔ **اللھم وَفِّقنا لھذا** ☆ ☆

اسلام اور طبِّ نفسیات

(ISLAM AND PSYCHOLOGICAL MEDICINE)

پروفیسر ڈاکٹر محمد شریف چوہدری

صدر شعبہ نفسیاتی و اعصابی سروسز ہسپتال / علامہ اقبال میڈیکل کالج، لاہور

مذہب انسانی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ بات نہایت شدت سے محسوس کی جارہی ہے کہ موجودہ اعصابی دباؤ کے دور میں مادہ پرستی نے انسان کو ایک اندھی دوڑ میں مصروف کردیا ہے۔ عملی اعتبار سے دینی اقدار نہ صرف لوگوں کی زندگی میں سکون اور ٹھہراؤ لانے میں معاون و معالج ثابت ہوتی ہیں ' بلکہ ذہنی اور جسمانی نشوو نما میں بھی مدد دیتی ہیں۔ انسان کیا ہے؟ انسان وجہ تخلیق کائنات ہے۔ اسے اشرف المخلوقات کا خطاب ملا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا نائب (خلیفہ) بنایا[1] ' اسے العلم سے نوازا اور اس دنیا میں بھیجا تاکہ وہ اللہ کی بندگی اختیار کرے اور الہامی قوانین کی پابندی کرتے ہوئے کائنات کو تسخیر کرے[2]۔ انسان کو اس دنیا میں ایک مقررہ مدت کے لئے بھیجا گیا کہ وہ اللہ کے رسولوں کے ذریعے آنے والی واضح ہدایت کے ساتھ اچھے برے اور صحیح و غلط میں تمیز کرسکے اور اس پر عمل پیرا ہو سکے۔ یہ دنیا ایک عارضی جائے قیام ہے ' ایک ایسی امتحان گاہ ہے جہاں اسے اپنے اعمال کے مطابق برا یا بھلا پھل ملے گا۔ امتحان کے بعد اسکے اعمال (نیک و بد) کا وزن کیا جائیگا اور اللہ کی جناب میں روز قیامت اس کا محاسبہ ہو گا۔ اس کی حیثیت کے مطابق اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ ہمیش کیلئے جنت کے باغات میں جگہ دیں گے یا ابد الآباد کیلئے وہ جہنم کے گڑھے میں دھکیل دیا جائیگا۔

انسان روح و جسم کا حسین امتزاج ہے۔ انسان ' کائنات اور خدا ایک وحدت کا حصہ ہیں۔ اللہ کی اطاعت میں وحدتِ نفس اور خیالات کی ہم آہنگی یقیناً ذہنی صحت کا منہ بولتا

---

[1] وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (سورۃ البقرہ ' آیت ۳۰)

[2] وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ (سورۃ الجاثیہ ' آیت ۱۳)

ثبوت ہیں۔ جو شخص الہامی قوانین کا اپنے دل کی گہرائیوں سے اقرار و اقبال کرتا ہے اور محبت' خلوص اور صدقِ دل سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی کلی اطاعت اختیار کرتا ہے وہی تو اللہ کا دوست ہے' اسے بے خوف ہو جانا چاہئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ (یونس: ۶۲)

"جان لو کہ اللہ کے دوستوں کو نہ کسی قسم کا خوف ہے نہ حزن"

اس خود اعتمادی کیلئے یقین کی ضرورت ہے جو ایمان کی پیداوار ہے۔ خدائے بزرگ و برتر پر ایمان (توحید) اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہی اسلام کی جڑ ہے۔ چنانچہ ذہنی صحت (سکون قلبی) ہی قربِ خداوندی ہے اور خدا سے دوری کا نتیجہ ذہنی پراگندگی ہے۔ رسول پاکؐ کا فرمان ہے:

اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلَحَت صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ' اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ (متفق علیہ' عن نعمان بن بشیرؓ)

"جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا (عضو) ہے جو اگر صحیح کام کرے تو ہر شے ٹھیک رہتی ہے۔ وہ عضو دل (قلب انسانی) ہے"۔

اس گوشت کے لوتھڑے کے علاوہ ایک اور غیر جسمانی یعنی روحانی قوت بھی ہے جسے خودی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ شخصیت کی پرورش کے لئے اس کی نشوونما نہایت ضروری ہے۔ بقول امام غزالی "دل' روح' نفس اور عقل خودی ہی کے تابع ہوتے ہیں۔" روح من جانب اللہ ہے[۳] اور اسی کے حکم سے جسم میں سرایت کئے ہوئے ہے اور یہ زندگی کے مشابہ ہے' روح کے بغیر انسانی جسم صرف ایک خول ہے چنانچہ نفسیاتی بیماریاں روحانیت سے متعلق ہیں۔

بچہ فطرتِ سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر ماحول اور حالات و واقعات ہی اسے اچھا یا برا بناتے ہیں اور اسکی خودی پروان چڑھتی ہے۔

خودی کے تین درجے ہیں:

۱) پہلا درجہ "نفسِ مطمئنہ" ہے' یہ نفس انسانی کا مطمئن ترین درجہ ہے۔ اسی میں مکمل سکون حاصل ہوتا ہے۔

---

[۳] وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (سورۃ بنی اسرائیل' آیت ۸۵)

۲) دوسرا درجہ "نفسِ لوامہ" ہے۔ یہ آدمی کا شعور یا ضمیر ہے جو اسے نامکمل ہونے اور ناپختگی کا احساس دلاتا ہے۔ لہٰذا وہ اتمام و کمال کے درجہ پر فائز ہونے کیلئے جدوجہد کرتا ہے۔

۳) تیسرے درجے پر "نفسِ امارہ" ہے، یہی نفس کی وہ نچلی سطح (baser self) ہے جو کہ ایک طرح کی "مکمل بے سکونی" کی سٹیج ہے۔ اس میں انسان اپنے جبلی داعیات اور حیوانی تقاضوں کی بے چون وچرا تکمیل (application) چاہتا ہے۔

آخری دو درجے عموماً شیطانی خواہشات کا شکار ہو جانے کا احتمال رکھتے ہیں، نتیجۃً ایک غلط اور ناقابلِ ستائش برتاؤ ہمارے سامنے آتا ہے۔

اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں بلکہ مکمل دین (ضابطۂ حیات) ہے جو کرۂ ارضی پر اپنے ماننے والوں کی زندگیوں پر گہری چھاپ چھوڑتا ہے۔ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اسلام بلا امتیازِ رنگ و نسل یا قوم ایک ابھرتی ہوئی اور اتحاد قائم کرنے والی قوت ہے۔

اسلامی ثقافت اپنے ماننے والوں کی زندگیوں کو مجموعی طور پر متأثر کرتی ہے۔ یہ بیماری اور مایوسی میں عموماً اور نفسیاتی پریشانیوں میں خصوصاً مفید نفسیاتی پہلو اور متحرک بنیاد فراہم کرتی ہے۔

قرآن مجید کوئی میڈیکل کی کتاب نہیں ہے بلکہ نفسیاتی طور پر توحید، خودی اور اختیارِ خودی پر اچھائی کی طرف انسان کیلئے ہدایت ہے۔ نفسیاتی مسئلے مثلاً شراب نوشی، خودکشی، قتل اور زنا بالجبر جو معاشرے کو مکمل تباہی کی طرف دھکیلتے ہیں، ان سب کیلئے مکمل ضابطۂ حیات قرآن مجید میں موجود ہے۔

قرآن مجید آخری الہامی کتاب ہے اور قیامت تک اس میں تحریف ناممکن ہے، جیسا کہ ربِّ جلیل نے قرآن میں خود فرمایا ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ○ (الحجر:۹)

"بے شک ہم ہی نے اسے نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اسکے محافظ ہیں"

قرآن کے اور بہت سے موضوع دماغی صحت سے متعلق بحث کرتے ہیں، مثلاً شادی، طلاق، اہل خانہ سے تعلقات، یتیموں، بیواؤں اور بوڑھوں کا خیال خاص، اہمیتِ تعلیم اور دوسرے بہت سے قوانین جو انسانی رشتوں سے متعلق ہیں۔ یہ سب اسی لئے ہے کہ ہر

کوئی ذہنی' جسمانی اور روحانی طور پر صحت مند رہے۔

حضور اکرمؐ نے نفسیاتی پہلوؤں پر' جو جسمانی بیماریوں سے متعلق ہیں' مندرجہ ذیل حدیث میں خاص زور دیا ہے: "پریشانیوں سے گھرا ہوا شخص بیمار جسم کا مالک ہے"۔

قرآن اور حدیث ایک خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں ---- وہ خدا جو خالقِ کائنات ہے' جو مدد اور آزمائش کرتا ہے اور جو بیماری سے شفا دیتا ہے۔ یہ یقینِ قلبی بندے کو احساسِ تحفظ اور بے چینی سے سکون عطا کرتا ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ: **اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ** (سورۃ البقرہ' آیت ۱۵۶' ترجمہ: "ہم اللہ کیلئے ہیں اور اسی کی طرف واپس جانے والے ہیں") مسلمان کے لئے دکھ درد سے نجات اور تکالیف سے تسلی و تشفی دیتے ہیں۔

یہ یقینِ قلبی (ایمان) اسلام کا پہلا ستون ہے۔ اسلام نے اپنے بندوں پر پانچ وقت کی نماز مرحمت فرمائی ہے جو مکمل سر تسلیم خم کرنا ہے اور اللہ سے صحت و راہنمائی حاصل کرنا ہے۔ نماز سے پہلے وضو جسم کو نرم اور ڈھیلا بنا دیتا ہے اور زندگی کی پریشانیوں اور گھبراہٹوں سے نبرد آزما ہونے کیلئے معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

اَلطّھورُ نصفُ الایمانِ (رواہ الترمذی)

"پاکیزگی نصف ایمان ہے"۔

صومِ رمضان ضبطِ نفس سکھاتا ہے' مثلاً بھوک' غصہ' شہوت' نفرت وغیرہ پر قابو سکھاتا ہے اور دوسرے بہت سے حادثات اور جرائم سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ ڈیپریشن اور دوسری نفسیاتی بیماریوں کا گراف رمضان المبارک میں گر جاتا ہے (تہجد تھرانی' ۸۵ء)

اسلام نفاذِ زکوٰۃ کے نظام کو بروئے کار لا کر دولت کی تقسیم کو باضابطہ بناتا ہے۔ سالانہ آمدنی کا ۲.۵۰ ٪ زکوٰۃ کی شکل میں ضرورت مندوں کو دیا جاتا ہے۔ اس سے مسلمانوں میں ایک بھائی چارے کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ مسلمان ممالک میں شراب نوشی کا شوق باقی ممالک کی نسبت بہت کم ہے کیونکہ اسلام میں یہ حرام کا درجہ رکھتی ہے۔ بعینہٖ مسلمانوں میں خودکشی کی شرح بھی مغرب کے مقابلے میں آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان مریض کی تشخیص اسلامی ثقافت کی روشنی میں بنیادی درجے کی حامل

ہے۔ ماہرِ نفسیات کو اپنے مریض کے مذہبی رجحان کا بخوبی علم ہونا چاہئے تاکہ وہ اسکے یقین (faith) کا جائزہ لے سکے جو نفسیاتی بیماریوں کے علاج معالجے میں کلید ہے۔ مسلمان مریض کے علاج کی بنیاد اسکے غیر متزلزل یقین باللہ ہی میں مضمر ہے۔ اسلام میں معاشرہ اور خاندان انسانی تعلقات کیلئے بحیثیت اساس ہیں۔ عالم اسلام میں تغیر کے باوجود، اسلامی معاشرہ اپنے بزرگوں کو نہایت عزت و احترام سے دیکھتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بوڑھے والدین سے بے اعتنائی ایک معاشرتی ناسور کا درجہ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری سوسائٹی میں نفسیاتی دھکم پیل بہت کم ہے۔ اور یہ قرآنی تعلیمات ہی کی مہربانی کا ثمرہ ہے۔ قرآن مجید میں والدین کے لئے یہ دعا سکھائی گئی: **رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا** (سورۃ بنی اسرائیل، آیت ۲۴، ترجمہ: "اے اللہ میرے ماں باپ پر مہربانی فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے پالا جب میں چھوٹا سا تھا۔") دباؤ کا علاج عالم مغرب کیلئے بہت بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ اسلام یکسوئی کو ضروری خیال کرتا ہے اور مسلمانوں کو اس کی پرزور دعوت دیتا ہے۔

سورۃ الرعد میں فرمایا گیا: **اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ** (آیت ۲۸، ترجمہ: "جان لو اللہ کے ذکر سے ہی دل قرار پاتے ہیں۔") اضمحلال، پریشانی اور بوجھل حالات میں سکون (relaxation) اپنی توجہ کو ایک نقطہ پر مرکوز کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ارتکازِ توجہ کی ایک شکل یہ ہے کہ نماز کے بعد پر سکون حالت میں (آلتی پالتی مار کر) بیٹھا جائے، آنکھیں بند ہوں اور صرف ایک لفظ یعنی اللہ یا سبحان اللہ کا ورد (ذکر) کیا جائے بشرطیکہ ذہن باقی تفکرات سے بالکل خالی ہو۔ یہ سلسلہ ۲۴ گھنٹوں میں پندرہ بیس منٹ کیلئے نماز فجر سے پہلے اور بعد از عشاء جاری رکھا جائے۔

احساسِ جرم (Guilt) ایک انسان کی ذہنی حالت (نفسیاتی صحت) تباہ کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایک مومن کا یقینِ کامل توبہ اور استغفار میں ہے اور مندرجہ ذیل آیت کی تلاوت کرتے ہوئے وہ سکون محسوس کرتا ہے:

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ
مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (الانعام: ۵۴)

"تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت واجب کرلی ہے اور تم میں سے

جو کوئی برائی کرے اور وہ دل و جان سے پشیمان بھی ہو اور وہ عمل صالح بھی کرے تو اللہ بھی مہربان اور معاف کرنیوالا ہے۔"

چند شدید جذبات مثلاً غصہ وغیرہ بہت سی نفسیاتی و جسمانی بیماریوں کو جنم دیتا ہے۔ ان جذبات کے خلاف مومن کی رہنمائی کی جاتی ہے جیساکہ مندرجہ ذیل آیت سے ظاہر ہے

وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○

(آل عمران:۱۳۴)

"جو اپنے غصے پر قابو پاتے ہیں اور دوسرے کے قصور معاف کرتے ہیں۔ یقیناً اللہ احسان کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔"

بہت سے وہم و گمان انسان کیلئے تباہی کا باعث بنتے ہیں لہٰذا اوہام وغیرہ مذہبی تضاد رکھنے والوں کی پریشانی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں، ان سب میں سرفہرست گمان ہے اور اس کے لئے قرآن میں راہنمائی ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ

(الحجرات:۱۲)

"اے ایمان والو! زیادہ گمان سے بچو، بے شک بہت سے ظن گناہ ہیں۔"

مذہبی طریقہ علاج سے ایسی بہت سی تکلیف دہ بیماریوں سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ نفسیاتی و ذہنی بیماریوں کی ایک بہت بڑی وجہ احساس جرم اور تفکر و پریشانی ہے اور یہی چیز آگے جاکر ایک تخریبی سوچ یا عمل کو جنم دیتی ہے۔ نتیجتہً زندگی اجیرن ہو کر رہ جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل آیت ایک مومن کیلئے یاددہانی ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ....... وَ اسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء:۳۲)

" اور اس چیز میں حسد و بغض نہ کرو جس میں اللہ نے کسی ایک کو کسی دوسرے پر فضیلت دی ہے، .... بلکہ اللہ سے اسکا فضل چاہتے رہو۔"

راقم الحروف نے ڈیپریشن اور ذہنی بیماریوں کے علاج کیلئے "تہجد تھیراپی" بھی وضع کی ہے جو کہ ایک کامیاب طریقہ علاج ہے۔[ے]

[ے] ملاحظہ ہو پروفیسر صاحب کا مضمون "تہجد تھراپی"۔ حکمت قرآن اکتوبر ۸۸ء

چنانچہ نفسیاتی بیماریوں کیلئے بہترین طریقہ علاج حصول سکون قلب میں مضمر ہے جو ذکر اللہ اور نماز ہے، جو مومن کے دل و دماغ کو صاف و شفاف بناتے ہیں، لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ عقیدہ پختہ ہو اور خود کو مکمل طور پر اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ قرآن کی قوت شفاء مندرجہ ذیل آیت سے اظہر من الشمس ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۗءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (بنی اسرائیل:۸۲)

"اور ہم نے قرآن میں مومنون کیلئے شفاء و رحمت نازل کی ہے"

مترجم
ڈاکٹر محمد خالد حمید ضیغم
قرآن کالج لاھور

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف
راہِ نجات
سُورۃ العصر کی روشنی میں
جو ایک نہایت وقیع تحریر اور ایک حد درجہ جامع تقریر پر مشتمل ہے
کا نیا ایڈیشن نئی آب و تاب اور عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
قیمت اعلیٰ ایڈیشن: -/۳۰ روپے (مضبوط دیدہ زیب جلد، سفید کاغذ)
" اشاعتِ عام: -/۱۰ " (غیر مجلّد، دبیز اخباری کاغذ)
شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور، ۳۶- کے، ماڈل ٹاؤن،

حکمتِ اقبال

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور فلسفۂ سیاست

ریاست کی تعریف

انسانی افراد جب کسی نصبُ العین کے ماتحت ایک آزاد جماعت کی صُورت میں منظم ہو کر اپنی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں تو ہم ان کے اس عمل کو سیاست کہتے ہیں اور ان کی منظم جماعت کو ریاست کا نام دیتے ہیں

بعض وقت ایک جماعت جو کسی خاص نصبُ العین پر متفق ہو چکی ہو ایسی مشکلات سے دوچار ہوتی ہے کہ وہ ایک ریاست نہیں بن سکتی اور کسی دُوسری ریاست کے ماتحت غلامی کی حالت میں رہنے پر مجبور ہوتی ہے لیکن ایسی نظریاتی جماعت ہمیشہ آزاد ہونے اور ایک ریاست کی صُورت میں آنے کی کوشش کرتی رہتی ہے اور اگر جماعت کا نصبُ العین جاندار ہو تو یہ کوشش زُود یا بدیر کامیاب ہوتی ہے۔ تاہم جب تک یہ کوشش کامیاب نہیں ہوتی ان کی تنظیم بھی، جو ان کے مشترک نصب العین کی وجہ سے کسی نہ کسی درجہ میں ضرور موجود رہتی ہے، کامل نہیں ہوتی۔ اس قسم کی نظریاتی جماعت بھی بالقوہ ایک ریاست ہی ہوتی ہے کیونکہ اس پر بھی ایک ریاست کے قدرتی قوانینِ زندگی صادق آتے ہیں۔

سیاست کی بنیاد خدا کی محبّت کا فطری جذبہ ہے

انسان کے دُوسرے تمام اعمال کی طرح انسان کے سیاسی عمل کا باعث بھی یہی حقیقت ہے کہ انسانی خودی کی اصل خدا کی محبّت کا ایک طاقتور جذبہ ہے اور اس کے سواتے اور کچھ نہیں۔ خدا کی محبّت کا یہی فطری جذبہ وہ قوّت ہے جو نصبُ العین کی محبّت کی منظّم انسانی جماعتوں یا ریاستوں کو وجود میں لاتی اور قائم رکھتی ہے۔ اگرچہ انسان کا جذبۂ محبّت خدا کے لیے ہے اور خدا کی محبّت سے ہی مکمل اور مستقل تشفی پا

سکتا ہے، تاہم جب کوئی فردِ انسانی اپنے غلط قسم کے تعلیمی اور اخلاقی ماحول کی وجہ سے خدا کی صفاتِ حسن و کمال کا ذاتی احساس نہ کر سکے تو پھر بھی اس کی محبت کا یہ طاقت ور جذبہ رُکتا نہیں، بلکہ کسی غلط یا ناقص نصبُ العین کی راہ سے اپنا اظہار پانے لگتا ہے۔ اس صورت میں وہ اپنے جذبۂ محبت کو پوری طرح مطمئن کرنے کے لیے اس نصبُ العین کی طرف ان تمام صفاتِ حسن و کمال کو منسوب کر دیتا ہے جو دراصل خدا کی صفات ہیں۔ اس طرح سے ایک غلط نصب العین انسان کے دل میں خدا کا قائم مقام بنتا ہے۔ ہر غلط نصبُ العین کا چاہنے والا ہمیشہ ایک ایسے غلط تعلیمی اور اخلاقی ماحول کی پیداوار ہوتا ہے جو اس خاص نصبُ العین کی محبت کو پیدا کر سکتا ہے۔ اگر حالات سازگار ہوں تو ایک نصب العین کو چاہنے والے افراد کی تعداد بڑھتی رہتی ہے، یہاں تک کہ اپنی اس حد کو پہنچ جاتی ہے جو نصب العین کی فطرت اور خصوصیات نے معین کر رکھی ہو۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اپنے نصب العین کی محبت اپنے تعلیمی اور نفسیاتی ورثہ کے طور پر دیتے ہیں اور ان کی اولاد میں متواتر اضافہ ہوتا رہتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ غیروں کو بھی اپنے نصب العین کی خوبی اور عمدگی کا قائل کر کے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ان کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس جماعت کے افراد اپنے مشترک نصب العین کی محبت کی وجہ سے ایک دوسرے کے لیے بھی ایک کشش محسوس کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا چاہتے ہیں۔ اتحاد کی یہ خواہش ان کو ایک قائد کے ماتحت منظم کر دیتی ہے، کیونکہ دلوں کا اتحاد تنظیم کے بغیر کوئی ٹھوس خارجی اور مرئی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی ایک منظم جماعت کو ہی ہم ایک ریاست یا مملکت یا سٹیٹ کا نام دیتے ہیں

جماعتی نظم کا آغاز

کسی نصبُ العینی جماعت کا منظّم ہونا اس کی زندگی کا کوئی ایسا مرحلہ نہیں ہوتا جو جماعت کے وجود میں آنے کے بعد کسی مناسب وقت پر نمودار ہوتا ہو، بلکہ جماعت کی تنظیم جماعت کے ظہور پذیر ہونے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ جماعت اور تنظیم ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی جماعت کی تنظیم اس قدر ناقص ہو کہ اسے تنظیم شمار نہ کیا جا سکے۔ ایک ہی نصب العین کو چاہنے والے دو افراد کی جماعت بھی تنظیم کے بغیر نہیں ہوتی، کیونکہ دونوں میں سے ایک دوسرے کو نصب العین کی

معرفت اور محبت میں اپنے آپ سے بہتر اور برتر سمجھتا ہے اور اپنا قائد تسلیم کرتا ہے۔ ہر نصب العینی جماعت پیدا ہوتے ہی منظم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد ممکن حد تک ترقی کرتی رہتی ہے اور اس کی تنظیم بھی اس کی توسیع کے ساتھ اس کے افراد کی محبت کی شدّت یا قوت کے مطابق ترقی یافتہ اور پیچیدہ ہوتی جاتی ہے۔ تاہم جب تک ایک منظّم جماعت کی تنظیم افراد کی پوُری زندگی کو ضبط میں لانے کے لیے آزاد نہ ہو اور اس کو فی الواقع ضبط میں نہ لائے اُس وقت تک وہ ایک ریاست نہیں کہلاتی۔

ریاست کی قوّتِ حیات

خدا یا خدا کے قائم مقام غلط تصوّر کی محبت مملکت کی قوّتِ حیات یا روح یا زندگی ہے جس کے بغیر وہ مر جاتی ہے۔ اگر ایک جاندار کے جسم سے قوّتِ حیات رخصت ہو جائے تو وہ اسی وقت مر جاتا ہے۔ اسی طرح سے اگر کسی مملکت کا نصب العین کسی وقت غائب ہو جائے تو ضروری ہے کہ وہ مملکت اپنے وظائف کے تمام شعبوں کے سمیت اسی وقت ختم ہو جائے۔ جس طرح سے خون کا دَورہ ایک جاندار کے جسم کے کونے کونے کو قوت بہم پہنچاتا اور اپنے وظائف کو انجام دینے کے لیے زندہ رکھتا ہے اسی طرح سے ریاست کے نصبُ العین کی محبّت اس کے مختلف محکموں کو زندہ اور فعال رکھتی ہے مملکت کے افراد میں نصب العین کی محبّت جس قدر کمزور ہوتی ہے اسی قدر مملکت بھی کمزور، غیر متّحد اور غیر منظّم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایک منظّم انسانی جماعت کے افراد جس قدر زیادہ اپنے نصبُ العین سے محبت رکھتے ہوں اسی قدر زیادہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بھی محبّت رکھتے ہیں اور اسی قدر زیادہ ان کی جماعت زندہ، صحت مند، طاقت ور، متحد اور منظّم ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر مملکت اپنے تمام ذرائع تعلیم و تربیت کو جن میں اسکول، کالج، یونیورسٹی، پریس، پلیٹ فارم، مطبوعات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن شامل ہیں، اپنے نصب العین کی محبت کو مخالف تصورات کی مخالفانہ محبت سے بچانے اور ترقی دے کر درجۂ کمال پر پہنچانے کے لیے کام میں لاتی ہے۔ ہر ریاست اپنے نصب العین کے تقاضوں کو پُورا کرنے کے لیے نصب العین کے مطابق نہ صرف اپنا مخصوص تعلیمی نظام برپا کرتی ہے بلکہ اپنے مخصوص سیاسی، قانونی، اقتصادی، اخلاقی، اطلاعاتی، تجارتی، صنعتی، مالیاتی اور فوجی نظامات بھی قائم کرتی ہے۔ اِن تصریحات کا حاصل یہ ہے کہ جو قوّت ایک ریاست کو پیدا کرتی ہے، اسے متّحد اور منظّم کرتی ہے، اس کے تمام اعمال و افعال

کی نوعیت اور سمت مقرر کرتی ہے اور اسے زندہ، قائم اور ترقی پذیر رکھتی ہے، وہ خدا یا خدا کے کسی قائم مقام غلط تصور کی محبت ہوتی ہے۔ اور جس قدر اور جب تک یہ محبت طاقت ور ہوتی ہے اسی قدر اور اس وقت تک وہ ریاست بھی ترقی پذیر، طاقت ور، متحد اور منظم ہوتی ہے۔

خودی کا ذوقِ انجمن آرائی

ایک فردِ انسانی کی زندگی اس کی اپنی ذات میں منحصر ہوتی ہے۔ وہ ہر حالت میں دوسرے افراد سے الگ تھلگ اور منفرد زندگی بسر کرتا ہے اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھتا ہے۔ اس کے جذبات اور محسوسات، اس کے فیصلے اور عزائم، جو اس کو عمل پر آمادہ کرتے ہیں اس کے اپنے ہی دل میں پیدا ہوتے ہیں اور جب تک وہ اپنے قول یا فعل میں ان کا اظہار نہ کرے اس کے اپنے دل میں رہتے ہیں۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ اپنے فیصلے کرنے اور ان پر عمل کرنے کے لیے پوری طرح سے آزاد اور خود مختار ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنی آزادی اور خود مختاری کی پوری پوری نگہبانی کرتا ہے اور اگر کوئی اور آدمی ان میں دخل انداز ہونا چاہے تو پوری قوت سے اس کی مخالفت کرتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس کا سبب کیا ہے کہ وہ ایسے افراد کی جماعت کے ساتھ مل کر رہنے اور کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے جو اسی کے نصب العین کو چاہتے ہوں اور جماعت کی عائد کی ہوئی بندشوں اور رکاوٹوں کو قبول کرتا ہے اور اس کے جاری کیے ہوئے قوانین وضوابط کی پابندی کرتا ہے اور اس طرح سے اپنی انفرادیت، آزادی اور خود مختاری کو اس جماعت کی انفرادیت کی خاطر قربان کرتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ مصلحتاً یا مجبوراً ایسا کرتا ہے، کیونکہ ایسا کرنے سے وہ جماعت سے اعانت اور قوت حاصل کرتا ہے۔ وہ بہت سے ایسے خطرات سے محفوظ ہو جاتا ہے جو تنہا اور الگ تھلگ زندگی بسر کرنے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور اپنے نصب العین کے لیے بہتر اور زیادہ کامیاب جدوجہد کر سکتا ہے۔ لیکن اقبال ہمیں بتاتا ہے کہ اس کا سبب نہ کوئی مصلحت ہے نہ مجبوری، نہ کوئی خوف نہ امید، نہ دور بینی نہ مآل اندیشی، نہ جلبِ منفعت نہ طلبِ اعانت، نہ تمنائے قوت اور نہ مقصدِ حفاظت، بلکہ اس کا سبب فقط یہ ہے کہ انسانی خودی کی فطرت اس قسم کی ہے کہ وہ دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کے باوجود محفل سازی اور انجمن آرائی کا ذوق رکھتی ہے اور اس ذوق کو مطمئن کرنے سے جو فوائد اسے حاصل

ہوتے ہیں وہ محض ضمنی یا اتفاقی ہیں جو خودی کا اوّلین مقصود نہیں ہوتے۔ چونکہ خودی کی حقیقت فقط خدا کی محبّت کا ایک فطری جذبہ ہے اور خودی کی محفل آرائی اس کی فطرت کا ہی ایک تقاضا ہے صاف ظاہر ہے کہ خودی کا ذوقِ محفل آرائی اسی جذبۂ محبّت کا ایک پہلو ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدا کی محبّت کے فطری جذبہ کا تقاضا نہ صرف یہ ہے کہ خودی اپنی جُداگانہ منحصر بخود زندگی کو قائم رکھے بلکہ یہ بھی ہے کہ اس غرض کے لیے دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرے۔ یہی وجہ ہے کہ خودی کے ذوقِ محفل آرائی کے پیچھے نصب العین کی محبّت کا جذبہ کام کر رہا ہوتا ہے اور اس ذوق کی تسکین سے جو جماعت وجود میں آتی ہے اس کی بنیاد نصب العین کی محبّت ہوتی ہے اور وہ ایک نصب العینی جماعت ہوتی ہے۔ جماعتی زندگی کے بغیر خودی اپنے جذبۂ محبت کی مکمل تشفی حاصل نہیں کر سکتی اور نہ ہی اپنے کمال کو پہنچ سکتی ہے۔

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است

اے کہ باقافلہ بے ہمہ شو باہمہ رو

اپنے جذبۂ محبّت کی تکمیل اور تشفی چاہنے والے خودشناس لوگوں کا کام یہی ہے کہ وہ بیک وقت دوسروں سے الگ بھی رہتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ بھی۔

بروں ز انجمنے درمیان انجمنے
بخلوت اند و لے آنچناں کہ باہمہ اند

فرد کی تکمیل کے لیے جماعتی زندگی کی ضرورت

فرد کی ساری تگ ودَو کا مقصود بے شک اس کی اپنی انفرادیت ہی کی تکمیل ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ جب تک فرد اپنی انفرادیت کو جماعت کی انفرادیت میں گم نہ کرے اس کی اپنی انفرادیت کی تکمیل ممکن نہیں ہوتی۔ اگر فرد کو جماعت سے الگ کر دیا جائے تو خود فرد کی حیثیت سے بھی اس کی ہستی ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ ایک لہر اگر دریا میں رہے تو لہر ہے اور دریا سے باہر نکل آئے تو کچھ بھی نہیں رہتی۔

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

جس طرح سے ایک لہر صرف دریا میں ہی دیکھی جا سکتی ہے ایک فرد جماعت میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

جماعت کے باہر اس کی انفرادیت کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اگر ایک پھول کی ضرورت ہو تو اس کو چمن میں سے توڑا جا سکتا ہے جہاں باقی پھولوں کے ساتھ مل کر اس کی آبیاری اور نشوونما ہوتی ہے۔ فرد کی خودی کی فطرت تنہائی پسند ضرور ہے کیونکہ وہ فقط اپنی ہی آرزوؤں کی دنیا میں رہتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی تنہائی پسند فطرت کے تقاضے فقط جماعت سازی یا انجمن آرائی کے ذریعے سے ہی پورے ہو سکتے ہیں۔

در جماعت فرد را بینیم ما
از چمن او را چو گل چینیم ما
فطرتش وارفتۂ یکتائی است
حفظِ او از انجمن آرائی است

اسی بنا پر اقبال مسلمان کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی جماعت سے الگ نہ ہو، بلکہ جماعت کے ساتھ مل کر رہے، ورنہ اس میں اس کا اپنا اور جماعت دونوں کا زیاں ہے۔ انحطاط کے اس دور میں مسلمانوں کی جماعت میں اچھے راہ نماؤں کی کمی ہی نہیں بلکہ راہ پیماؤں کے ضبط اور نظم کا فقدان بھی ہے۔ ہم زیادہ دیر تک کسی راہ نما کے پیچھے نہیں چل سکتے اور جلد ہی اس کی معمولی اور قابلِ درگزر فرو گزاشتوں یا کوتاہیوں کی بنا پر اس سے بگڑ جاتے ہیں اور جماعت کی تنظیم سے الگ ہو جاتے ہیں اور ایک مقابل کی تنظیم قائم کر لیتے ہیں اور اس طرح سے ملّت کے انتشار اور ضعف کا سبب بنتے ہیں۔ حالانکہ اگر ہم جماعت میں رہ کر جماعت کے اتّفاق اور اتّحاد کو قائم رکھیں اور اس کی تنظیم کو انتشار سے بچائیں تو جماعت اپنے قائد کے ماتحت جو غلطیاں کرے گی اپنی تنظیم اور اس سے پیدا ہونے والی قوّت کی وجہ سے بآسانی ان کی تلافی بھی کرے گی اور اپنے اتحاد کی وجہ سے ترقی کے راستہ پر گامزن بھی رہے گی۔ جو مسلمان فرد جماعت سے بد دل ہو کر یا اس کی تنظیم یا قیادت سے مایوس یا ناخوش ہو کر جماعت سے الگ ہوتا ہے اقبال اسے ایک ایسی ٹہنی سے تشبیہہ دیتا ہے جو خزاں کے موسم میں درخت سے ٹوٹ جائے۔ وہ سوکھ جاتی ہے اور پھر تاقیامت موسمِ بہار کے برستے ہوئے بادلوں سے ہری بھری نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر وہ درخت کے ساتھ رہے تو جب بہار آئے گی وہ بھی پورے درخت کے ساتھ ہری بھری ہو جائے گی۔

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ　　　ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے　　　کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے

ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دَور خالی ہے جیبِ گُل زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق آموز ہو کہ تُو نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملّت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ!

ارشادِ نبویؐ کی حکمت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کہ جماعت کے ساتھ رہنا تم پر لازم ہے، جو جماعت سے الگ ہوا جہنم میں ڈالا گیا۔ (عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ) اس مضمون پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جماعت کے نظامِ ہستی کا دار و مدار فرد پر ہے، اگر فرد نہ ہو تو جماعت بھی نہیں رہتی، لیکن فرد کی ہستی کا دار و مدار بھی جماعت پر ہے۔ وہ جماعت کے وجود کا احساس کرنے کی وجہ سے اپنے وجود اور اپنی ممکنات کا احساس کرتا ہے۔ وہ جماعت کے اندر جماعت کے لیے اور جماعت کی وجہ سے زندہ رہتا اور کام کرتا ہے اور جماعت ہی کی وجہ سے اس کے مخفی کمالات آشکار ہوتے ہیں۔ جماعت کا آئین اس کی قوتوں میں اعتدال اور تحریک پیدا کرتا ہے اور جماعت میں داخل ہو کر وہ ایک نہیں رہتا، بلکہ جماعت بن جاتا ہے۔ جماعت کی قوت اس کی اپنی قوت ہو جاتی ہے۔ وہ ایک پھول سے چمن اور ایک قطرہ سے دریا بن جاتا ہے۔ لہٰذا جماعت کے اندر رہنا فرد کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ جماعت اس کی مخفی قوتوں اور قابلیتوں کی تربیت کر کے ان کو کمال تک پہنچاتی ہے۔ دوسروں کے ساتھ میل جول سے فرد پختہ ہوتا ہے، اس کی وحدت جماعت کی کثرت کے بالمقابل ہی نمایاں ہوتی ہے اور جماعت کی کثرت اس کی وحدت کے اندر سمٹ کر وحدت بن جاتی ہے۔ فرد جماعت سے احترام اور وقار حاصل کرتا ہے، لہٰذا جہاں تک ممکن ہو فرد کو جماعت کے اندر رہنا چاہیے، اس سے تعاون کرنا چاہیے اور اس کے کاروبار کی رونق کو بڑھانا چاہیے۔

فرد را ربطِ جماعت رحمت است جوہرِ اُو را کمال از ملّت است
پختہ تر از گرمیٔ صحبت شود تا بمعنی فرد ہم ملّت شود

آئینہ یک دیگر

فرد اور جماعت دونوں ایک دوسرے کا آئینہ ہیں، دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے اخلاقی اور ثقافتی معیار کا پتہ دیتا ہے۔ فرد اور جماعت کا باہمی تعلق ایسا ہی ہے جیسے ایک ایک موتی کا موتیوں کی لڑی سے یا ایک ایک ستارے کا کہکشاں سے۔ اگر ہر ایک موتی الگ موجود نہ ہو تو موتیوں کی لڑی کہاں سے آئے اور اگر ہر ایک ستارہ اپنا الگ وجود نہ رکھتا ہو تو کہکشاں کا وجود بھی نہ ہو۔ فرد جب جماعت میں گم ہوتا ہے تو ایک قطرہ سے سمندر بن جاتا ہے۔ جماعت کی وجہ سے اس کے دل میں جدوجہد کرنے اور ترقی کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور وہ جماعت ہی کی ضروریات کی روشنی میں یہ دیکھتا ہے کہ اس نے کیا کیا ہے اور کیا نہیں کیا، اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ جماعت کی امیدوں اور آرزوؤں میں شریک ہونا ایسا ہے جیسے کہ زمزم کا صحت بخش پانی پینا۔ جو شخص جماعت کی امیدوں اور آرزوؤں سے حصہ نہیں لیتا وہ اپنے اندر جدوجہد کرنے اور بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرنے کا کوئی جوش و خروش محسوس نہیں کر سکتا۔ اس کے نغموں کی گرمی اس کی بانسری کے اندر ہی سرد ہو جاتی ہے، اس کی قابلیتوں کا پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جاتا ہے۔ اکیلا فرد اپنی زندگی کے مقاصد سے بے خبر رہتا ہے اور اس کے عمل کی قوتیں منتشر ہو کر ضائع ہو جاتی ہیں۔ یہ قوم ہی ہے جو اسے ایک نظم یا ضبط کے ماتحت اور قوم کے مشترک نصب العین کے لیے کام کرنا سکھاتی ہے اور اس کی حرکتِ عمل کی سمت معین کر کے اس کے لیے ممکن بناتی ہے کہ وہ بادِ صبا کی طرح ایک مضبوط اور دھیمی رفتار سے چل سکے۔ یہ صحیح ہے کہ جماعت میں رہ کر اسے جماعت کے قانون کا پابند ہونا پڑتا ہے لیکن چونکہ یہ پابندی اسے ایسے کاموں سے روکتی ہے جو اس کے اپنے کمالات کی آشکارائی کے لیے مضر ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ پابندی اس کی اصلی فطرت کو مقید نہیں کرتی بلکہ آزاد کرتی ہے۔ اس پابندی کی وجہ سے وہ شمشاد کی طرح چمن میں آزاد بھی ہوتا ہے اور پابگل بھی۔

فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند سلک و گوہر کہکشاں و اختر اند
فرد تا اندر جماعت گم شود قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
مایہ دار سیرتِ دیرینہ اُو رفتہ و آئندہ را آئینہ اُو
پیکرش از قوم و ہم جانش ز قوم ظاہرش از قوم و پنہانش ز قوم

دردِ بش ذوقِ نو از ملّت است   احتساب کارِ اُو از ملت است
ہر کہ آب از زمزمِ ملّت نخورد   شعلہ ہائے نغمہ در عُودش فسرد
فردِ تنہا از مقاصد غافل است   قوتش آشفتگی را مائل است
قوم باضبط آشنا گرداندش   نرم روشلِ صبا گرداندش
پا بہ گِل مانندِ شمشادش کند   دست و پابند و کہ آزادش کند
چوں اسیرِ حلقۂ آئیں شود   آہوئے رم خوئے اُو مشکیں شود

جماعت آفرینی کا جذبہ

انسان کی خودی یک شناس ہے، وہ صرف خدا کو چاہتی ہے جو ایک ہے اور جب ایسا ہے کہ وہ خدا کو نہیں پہچانتی اور غلطی سے اس کے کسی قائم مقام تصور کو چاہتی ہے تو وہ بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے دل میں دو نصب العینوں یا دو معبودوں کی محبت کے لیے گنجائش نہیں۔ محبّت کرنا دل کا کام ہے لیکن جیسا کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے، خدا نے کسی آدمی کے پہلو میں دو دل پیدا نہیں کیے (مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ)[1] جب دل ایک ہے تو معبود بھی ایک ہی ہو سکتا ہے۔ یک شناس فطرت رکھنے کے باوجود خودی کے جذبۂ محبّت کا ایک زبردست تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کے چاہنے والوں کی ایک جماعت میں رہے۔ پھر اس کی محبت کا تقاضا صرف یہی نہیں کہ جب جماعت موجود ہو تو وہ جماعت میں رہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ جب جماعت موجود نہ ہو تو وہ اپنے نصب العین کی تبلیغ کر کے دوسروں کو اس کا معتقد بنائے اور اپنے ہم خیال لوگوں کی ایک جماعت پیدا کرے، اور پھر متواتر اس کی توسیع اور ترقی کے لیے کوشش کرتا رہے۔ یہاں تک کہ پوری نوعِ انسانی اس جماعت میں شامل ہو جائے۔

بخلوت انجمنے آفریں کہ فطرتِ عشق
یکے شناس و تماشا پسند بسیاری است

یہی وجہ ہے کہ ہر ریاست اپنے اطلاعاتی، مطبوعاتی اور نشریاتی مشروعات کے ذریعے سے دنیا بھر

---

[1] سورۃ الاحزاب، آیت ۴

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

سیرت و سوانح

عبدالرشید عراقی

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح

(۳)

درس و تدریس کا آغاز اور دینی مدرسہ کی بنیاد

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح نے حجاز سے واپسی کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور باقاعدہ ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :۔

> "شمالی ہندوستان میں اس زمانہ میں یہ پہلا مدرسہ تھا جہاں سے شریعت و سنت کی آواز بلند ہوئی۔ اس مدرسہ کا نصابِ تعلیم دوسری درسگاہوں سے بالکل مختلف تھا۔ یہاں قرآن و حدیث کو تمام علوم دینی کا مرکزی نقطہ قرار دے کر تعلیم دی جاتی تھی۔"[1]

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح نے جب درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو اُن سے پہلے ہندوستان میں دینی علوم یعنی قرآن و حدیث کی جانب توجہ کم تھی۔ اور دوسرے علوم یعنی نجوم، فلکیات، ریاضی، منطق اور فلسفہ پر ساری توجہ مرکوز تھی۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں :

> "ہندوستان میں دینی علوم بالخصوص قرآن و حدیث کی تعلیم و تعلّم کی جانب توجہ کم رہی۔ چنانچہ سندھ اور ملتان وغیرہ سے عربوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد جب غزنوی اور غوری سلاطین برسرِ اقتدار آئے تو اُن کے زمانے میں ایران، خراسان اور ماوراءالنہر کے علاقوں سے جو اصحابِ علم و درس

---

[1] حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۲۵

> ہندوستان میں آئے اُن کو دینی علوم، تفسیر و حدیث میں زیادہ درخور نہ تھا۔ اس کی وجہ سے یہاں علمِ حدیث عنقا کی طرح معدوم ہوگیا اور نجوم، فلکیات ریاضی اور منطق و فلسفہ پر ساری توجہ مرکوز کردی گئی۔۔ قرآن مجید اور سنّتِ نبوی ؐ کو پڑھنے پڑھانے کی بجائے دینی علوم میں صرف فقہ و تصوّف سے سرکار باقی رہ گیا تھا۔ فقہ میں سارا زور فقہِ حنفی کے فروع و جزئیات پر صرف کیا جاتا تھا۔ علمِ حدیث کی کسمپرسی اور غربت کا یہ حال تھا کہ اس سے صرف اس بنا پر اور اس حد تک سروکار رہ گیا تھا کہ فقہی بحثوں میں کہیں کہیں حدیثوں کا ذکر آجاتا تھا۔ حدیث کی اُمّہاتِ کتب کی بجائے صرف صاغانی کی "مشارق الانوار" درس و تدریس میں داخل تھی۔ اگر کسی نے اس کے سوا توجہ دی تو 'مصابیح السنہ' بغوی اور 'مشکوٰۃ المصابیح' کو بھی دیکھ لیا۔ محدّث بننے کے لیے بس اسی قدر کافی تھا" [1]

محی السنۃ مولانا سید نواب صدیق حسن خاں قنوجی رئیسِ بھوپال (م ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۹۰ء) نے اس دَور کا نقشہ کھینچا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> "علم حدیث کا سرے سے کوئی چرچا نہ تھا۔ لوگ نہ خود اس کی جانب مائل تھے اور نہ دوسروں کو اس کے حصول کی کوئی ترغیب دیتے تھے۔۔ وہ اِس فن کی کتابوں سے ناواقف اور محدثین کے ناموں سے ناآشنا تھے۔ بہت تھوڑے لوگ صرف مشکوٰۃ پڑھ لیتے تھے اور وہ بھی محض حصولِ برکت کے لیے۔ اِس پر عمل کرنا اور اس کو سمجھنا اُن کا مقصد نہ ہوتا تھا۔ فقہ میں صرف فقہِ حنفی اور علمائے ماوراء النہر کے فتوؤں اور اجتہادات پر قانع ہوگئے تھے اور محض فروع و جزئیات میں اُلجھے رہتے تھے۔ اُن کا راس المال فقہ تھی اور وہ بھی تقلیدی رنگ و انداز میں۔۔ تحقیق سے معدودے چند لوگوں کو ہی دلچسپی تھی" [2]

---

[1] تذکرۃ المحدثین، ج ۳، ص ۲۰۵- ۲۰۶۔ [2] الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ، ص ۷۰

مولانا حکیم سید عبدالحی الحسنی (م ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء) نے بھی اپنی کتاب "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" میں انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ [1]

علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) تحریر فرماتے ہیں:

> "محمد تغلق (م ۷۵۲ھ) جس کے براہِ راست تعلقات مصر کی عباسی خلافت سے تھے اور اس کی طرف سے اس کو حکومت کا فرمان اور خلعت اور علم بھی ملا تھا اور خلیفہ عباسی سے اس نے بیعت بھی کی تھی، اس کا قاعدہ تھا کہ جب لوگوں سے بیعت لیتا تھا تو مصر کے خلیفہ عباسی کے فرمان کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور "مشارق الانوار" کا نسخہ سامنے رکھ لیتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک ہندوستان میں قرآنِ پاک کے بعد احادیث میں صرف مشارق الانوار کا وجود تھا۔ جب شاہی کتب خانہ کا یہ حال تھا تو عام لوگوں کی دسترس کا کیا پوچھنا ہے۔ الغرض شیخ عبدالحق محدث سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی (الاہوری المتوفی سنہ ۶۵۰ھ) کے نسخے اور کہیں کہیں مصابیح (اصل مشکوٰۃ للبغوی المتوفی سنہ ۵۱۶ھ) کے نسخے دستیاب ہوتے تھے اور یہی دو کتابیں یہاں کے علماء کے درس میں تھیں۔" [2]

علماء و اصحابِ درس کی یہ حالت تھی کہ وہ نصوص کی بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے اور نہ بحث و استدلال میں حدیث کو حجت بناتے تھے۔ اجتہاد و تحقیق کا دروازہ بالکل بند تھا۔ قرآن و حدیث کی بجائے صرف فقہ کا سہارا لیتے تھے، نصوص کی بے دھڑک توجیہ و تاویل کرتے تھے۔ معقولات و منقولات کی طرف زیادہ توجہ تھی، جس کی وجہ سے دین کی حقیقت و صورت مسخ ہوتی جا رہی تھی، شریعتِ محمدیؐ کی روح غائب ہوتی جا رہی تھی اور بدعات اور گمراہیوں میں زور بڑھتا جا رہا تھا۔

حدیثِ نبویؐ سے بے اعتنائی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ منطق و فلسفہ کی کتابیں داخلِ نصاب کر لی گئی تھیں اور علمائے کرام علومِ عقلیہ و نقلیہ کی تعلیم پر زیادہ توجہ دے رہے

---

[1] الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، ص ۱۳۵ تا ۱۳۸ [2] مقالاتِ سلیمان ج ۲، ص ۷۴، ۷۵۔

تھے۔ مولانا حکیم سید عبدالحی الحسنی (م ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء) لکھتے ہیں:

> "اُس عہد میں منطق و فلسفہ سے شغف اور انہماک بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ ہندوستان کے تمام علمی مراکز میں منطق و فلسفہ کی کتابیں درس میں بکثرت داخل ہونے لگیں۔"[1]

اُس زمانہ کے امراء و سلاطین نے بھی اِس طرف توجہ نہ کی۔ وہ صرف شورشوں اور بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف رہے۔ ان حالات میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی مسندِ درس پر رونق افروز ہوئے اور انہوں نے دہلی میں ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ حضرتِ شیخ علومِ دینی سے مکمل بہرہ ور تھے اور انہوں نے علمائے حجاز سے مکمل استفادہ کیا تھا۔ اس لیے انہوں نے قرآن و حدیث کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد (م ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء) لکھتے ہیں:

> "مولانا جمال الدین کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق محدث حجاز سے واپس آئے۔ اللہ نے ان کی عمر مبارک میں برکت دی اور ان کی تدریس و تصنیف نے ایک پورا سلسلۂ تعلیم ملک میں قائم کر دیا۔"[2]

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> "شیخ محدث کا یہ دارالعلوم اُس طوفانی دَور میں شریعتِ اسلام اور سنتِ نبویؐ کی سب سے بڑی پشت پناہ تھا۔ مذہبی گمراہیوں کے بادل چاروں طرف منڈلائے، مخالف طاقتیں بار بار اس دارالعلوم کے بام و در سے آکر ٹکرائیں، لیکن شیخ محدث کے پائے ثبات میں ذرا بھی جنبش پیدا نہیں ہوئی۔ اُن کے عزم و استقلال نے وہ کام انجام دیا جو اُن حالات میں ناممکن نظر آتا تھا۔

ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے تھے اندازِ خسروانہ[3]

---

[1] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، ص ۲۹ [2] تذکرہ، ص ۳۰۱

[3] حیات شیخ عبدالحق محدّث دہلوی، ص ۱۲۶

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مدرسہ اور نصابِ درس میں دیگر علوم میں مرکزی حیثیت و اوّلیت حدیث کو حاصل تھی۔ اُن کے مدرسہ کی بنیاد ہی اصلاً اس پر تھی کہ قرآن و حدیث کی تعلیم کو عام کیا جائے اور معقولات و منقولات کی طرف بہت کم توجہ دی جائے۔ حضرت شیخ نے جو نصابِ درس مرتب کیا تھا اُس میں قرآن و حدیث کو تمام علوم کا مرکزی نقطہ قرار دیا تھا اور اُن کا اصل مقصد ہندوستان میں قرآن و حدیث کی اشاعت تھا۔ مولانا آزاد بلگرامی ؒ لکھتے ہیں :

> "حج سے واپسی کے بعد ۵۲ برس تک استقلال و دلجمعی کے ساتھ درس و تدریس کے مشغلہ میں منہمک رہے، اپنے فرزندوں اور دوسرے طلباء کو پڑھاتے، علوم و فنون بالخصوص حدیث کی ترویج و اشاعت کا کام انجام دیتے رہے۔ انہوں نے تعلیم و تدریس کا نیا انداز اور ایسا نہج اختیار کیا جس کو ممالکِ عجم کے متقدمین و متاخرین علماء نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اور اُن کا طریقۂ درس امتیازی خصوصیات کا حامل تھا اور مدرسہ عام مدرسوں سے ممتاز و مستثنیٰ تھا"۔[1]

تلامذہ

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے درس و تعلیم کو ہندوستان میں بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہندوستان کے علاوہ بلادِ اسلامیہ کے طلبہ بھی آپ سے مستفیض ہوئے۔ آپ کے تلامذہ و مستفیدین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہاں صرف چند مشہور تلامذہ کے نام لکھے جاتے ہیں :۔

شیخ نورالحق دہلوی (م ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء)، شیخ ہاشم ؒ، شیخ رضی الدین علی محمد، شیخ ابوالبرکات ولی الدین[2]، شیخ ابوالسیادت کمال الدین[3]، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی

---

[1] مآثرالکرام ج ۱، ص ۲۱۰،

[2] برہان دہلی، مارچ ۱۹۵۴ء، ص ۱۵۷

[3] عجالۂ نافعہ، معہ فوائد جامعہ، ص ۳۹

(م ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء) [1]، مولانا محمد حیدر دہلوی [2]، شیخ محمد حسین خانی نقشبندی [3]، خواجہ حیدر بن خواجہ فیروز کشمیری (م ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء) [4]، خواجہ خاوند معین الدین بن خواجہ خاوند محمود المعروف بحضرت ایشان (م ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) [5]، شاہ طیب نغز آبادی [6] مولانا شیخ ابواحمد سلیمان کُردی (م ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۱ء) [7]

---

[1] برہان دہلی، ۱۹۵۴، ص ۱۶۱

[2] ایضاً، ص ۵۸،

[3] فوائد جامعہ، ص ۳۹

[4] برہان دہلی، مارچ ۱۹۵۸ء

[5] مقالاتِ سلیمان، ج ۲، ص ۲۵

[6] تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۶۲

[7] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲

○

بقیہ: حکمتِ اقبال

کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنے نظریۂ حیات کے چاہنے والوں یا ہمدردوں میں شامل کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے امتیوں کی تبلیغِ دین اور جماعت آفرینی کے پیچھے خودی کے جذبۂ محبت کا یہی پہلو کام کرتا ہے، اگرچہ خدا کی وحی کی ہدایت سے اسے مزید تقویت اور توانائی بھی حاصل ہوتی ہے، بلکہ غلط تحریکوں کے غلط رو بانیوں اور ان کے پیروکاروں کی گمراہ کن تبلیغ اور تلقین کے عقب میں بھی خودی کے جذبۂ محبت کی یہی خصوصیت یعنی تماشائے بسیاری کی اُلفت کارفرما ہوتی ہے، اگرچہ اس صورت میں وہ بھٹکی ہوئی ہوتی ہے اور اپنے اصلی مقصود یا مدّعا کو نہیں جانتی۔

(جاری ہے)

○

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حُرمتی سے محفوظ رکھیں۔

سورۃ البقرۃ (۲۶)

آیت ۳۶، ۳۷

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیرِ مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳، اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲ : ۵ : ۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۲۶ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝۳۶ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۳۷

۲ : ۲۶ : ۱ اللغة

۲ : ۲۶ : ۱ (۱) [فَاَزَلَّهُمَا] یہ دراصل " فَ " (بمعنی پس / اس کے بعد) + " اَزَلَّ " (جس کے معنی ابھی بیان ہوں گے) + " هما " (ضمیر منصوب بمعنی ان دونوں کو) کا مرکب ہے ۔

اس میں لفظ " اَزَلَّ " کا مادہ " ز ل ل " اور وزنِ اصلی " اَفْعَلَ " ہے ۔ یہ دراصل " اَزْلَلَ " تھا ۔ پھر لام کی حرکت فتحہ (ـَ) ماقبل ساکن حرف (ز) کو دے کر دونوں " لام " مدغم کر دیے جاتے ہیں اور یوں لفظ " اَزَلَّ " بنا ۔

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " زَلَّ یَزِلُّ زَلَلاً " باب ضرب سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہوتے ہیں : " پھسلنا ' پھسل جانا " ۔ یعنی یہ فعل لازم ہے اس کا مفعول نہیں آتا ۔ البتہ جس چیز یا جگہ سے " پھسلے " اس کے ساتھ " عن " لگاتے ہیں مثلاً کہیں گے " زَلَّ عنِ الصوابِ " (وہ درست بات سے پھسل گیا) ۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے صرف ایک صیغہ ماضی (البقرہ : ۲۰۹) اور ایک صیغہ فعل مضارع کا (النحل : ۹۴) وارد ہوا ہے ۔

● زیرِ مطالعہ لفظ " اَزَلَّ " اس مادہ سے بابِ افعال کے فعل ماضی معروف کا پہلا صیغہ ہے ۔ اس باب سے فعل " اَزَلَّ ..... یُزِلُّ اِزلالاً " کے معنی ہیں : " ..... کو پھسلا دینا " اس لیے اس (اَزَلَّ) کا ترجمہ " ڈگایا ' ہلا دیا ' ہٹا دیا ' لغزش دے دی ' اکھاڑ دیا اور پھسلا دیا " کی صورت میں کیا گیا ہے جن سب کا مفہوم ایک ہے ۔ یہ فعل (اَزَلَّ یُزِلُّ) متعدی ہوتا ہے اور اس کا مفعول ہمیشہ بنفسہ (بغیر صلہ کے) آتا ہے ۔ جیسے یہاں " ازلهما " میں ضمیر منصوب " هما " آئی ہے ۔ البتہ جس چیز یا جگہ سے پھسلا دینے یا ڈگانے کا ذکر کرنا ہو تو اس پر " عَنْ " کا صلہ لگتا ہے مثلاً کہیں گے " اَزَلَّهُ عَنْ .... " (اس نے اس کو .... سے پھسلا دیا) ۔

(زیرِ مطالعہ آیت میں اسی لیے آگے " عَنْهَا " آرہا ہے)۔ قرآن کریم میں اس مادہ سے بابِ افعال کا صرف یہی ایک صیغۂ فعل اسی ایک جگہ آیا ہے۔

[الشَّيْطٰنُ] کے مادہ، وزن اور معنی وغیرہ کی مناسبت پر استعاذہ کی بحث میں بات ہوئی تھی (حکمت قرآن جون ۸۹ء ص ۴۹ تا ۵۱) ہم یہاں دوبارہ اس کا مختصراً ذکر کئے دیتے ہیں۔

یہ لفظ (شیطان) یا تو " شطَن یشطُن شطونًا " (نصر سے) بمعنی " بہت دور ہونا " سے " فَيْعَالٌ " کے وزن پر ہے ـــــ یا پھر " شاط یشیط شیطًا (ضرب سے) بمعنی " برباد ہونا ' (غصہ سے) جل بھن جانا " سے " فَعلان " کے وزن پر ہے۔

● لفظ " شیطان " (یہ اس کا رسم املائی ہے رسم عثمانی پر بعد میں بات ہوگی) اپنے عربی معنی کے ساتھ اردو (بلکہ بہت سی اسلامی زبانوں) میں مستعمل ہے اس لیے تمام مترجمین نے اس کا ترجمہ یہی (شیطان) کیا ہے۔ اگرچہ یہ لفظ (خصوصًا بصورتِ نکرہ) اور اس کی جمع " شیاطین " متمرد اور سرکش بلکہ "سرکشوں کے وڈیرے" کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ تاہم زیرِ مطالعہ عبارت میں یہ لفظ (شیطان) بظاہر قصہ آدم میں مذکور " ابلیس " (البقرہ : ۳۴ یعنی ۲:۲۵:۱(۲) میں) کے لقب یا صفاتی نام کے طور پر آیا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ متعدد جگہ اپنے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں (دونوں طرح) استعمال ہوا ہے۔ موقع (سیاق و سباق عبارت) معنی کے تعین میں مدد دیتا ہے۔

۲:۲۶:۱(۲) [عَنْهَا] یہ حرف الجر (عَنْ) اور ضمیر مجرور " ھا " (بمعنی " اس ") کا مرکب ہے۔

" عَنْ " ایک کثیر الاستعمال اور متعدد معانی دینے والا حرف الجر ہے۔ اس کا بنیادی مفہوم " کسی چیز سے دور جانے، الگ ہونے، ہٹنے، جُدا ہونے

اور چھوڑ دینے " کا ہوتا ہے اور اس کے قریباً تمام استعمالات میں اس بنیادی مفہوم کی جھلک پائی جاتی ہے ۔ اردو میں اس کا عام ترجمہ (مِنْ کی طرح) "سے" ہی کر لیا جاتا ہے تاہم موقع استعمال کے لحاظ سے ان دونوں کے مفہوم میں بڑا فرق ہوتا ہے ۔ اور خود " عَنْ " بھی مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے جن میں سے اہم اور زیادہ مشہور صورتیں حسب ذیل ہیں :

(۱) مجاوزہ یعنی کسی چیز یا جگہ کو چھوڑ کر آگے نکل جانے کا مفہوم ۔ اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ " ...... کو چھوڑ کر " سے کرنا مناسب ہوتا ہے ۔ مثلاً " سافرَ عَنِ البلَدِ " (وہ شہر سے ۔ یعنی اسے چھوڑ کر ۔ چلا گیا) ۔ (۲) بدل اور عوض کا مفہوم ۔ اس کا اردو موزوں ترجمہ " کی بجائے ، کے بدلے " ہو سکتا ہے جیسے البقرہ : ۴۸ میں ہے " لا تجزی نفسٌ عن نفسٍ " (کوئی کسی کے کام نہ آئے گا یعنی کسی کی سزا اس کی بجائے کسی دوسرے کی طرف منتقل نہ ہو گی) ۔ (۳) تعلیل یعنی سبب بتانے کا مفہوم ۔ اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ " کی وجہ سے یا بسبب " کیا جا سکتا ہے مثلاً " اِلّاَ عَنْ موعِدَۃٍ ..... (التوبۃ : ۱۱۴) " یعنی ایک وعدہ کی وجہ سے ..... " یا " ..... عن قولکَ ..... (ھود : ۵۳) یعنی تیرے کہنے پر " میں آیا ہے ۔ (۴) استعلاء یعنی ایک چیز کو دوسری چیز سے اوپر قرار دینے کا مفہوم ۔ اس کا مناسب اردو ترجمہ " ..... کے مقابلے پر " ہو سکتا ہے جیسے (ص : ۳۲ میں) " ..... عن ذکر ربی " (اپنے رب کی یاد کے مقابلے پر) میں آیا ہے ۔ (۵) بَعْدَ کے معنی میں جیسے عَنْ قَلِیلٍ (تھوڑی دیر کے بعد) ہی سے " عَنْ قَرِیبٍ " اردو میں بھی مستعمل ہے ۔ (۶) " بِ " یعنی " کے ساتھ " کے مفہوم میں جیسے " وما ینطق عن الھوٰی " (النجم : ۳) یعنی وہ خواہشِ نفس سے (کے ساتھ) ۔ بات نہیں کرتا " (۷) " علیٰ " یعنی " کے خلاف " والا مفہوم مثلاً " ومن یبخلُ فانما یبخلُ عن نفسہ

(محمد : ۳۸) " یعنی جو بخل کرے گا تو اپنے ہی خلاف کرے گا " ـــ (۸) " مِنْ " یعنی " کی طرف سے " کے معنی میں ۔ جیسے (التوبۃ : ۱۰۴ میں) " یقبل التوبۃَ عَن عبادہٖ " (وہ اپنے بندوں کی طرف سے توبہ قبول کرتا ہے) ۔ " عَنْ " کے یہ وہ مفہوم ہیں جن کی مثالیں قرآن کریم میں بھی مل جاتی ہیں ۔ اور یہ آئندہ ہمارے سامنے آئیں گی ۔ اوپر " عن " کے مختلف ترجموں کو خط کشیدہ کر دیا گیا ہے ان کو ذہن میں رکھیے ۔ اس کے علاوہ یہ (عن) بہت سے افعال کے ساتھ بطور " صلہ " استعمال ہوتا ہے اور اس کے محاوراتی استعمال تو بہت ہیں مثلاً " اِلیكَ عَنِّی " کا مطلب ہے ۔ " مجھ سے دور رہو " اور " عَنْ آخِرِھم " کا مطلب ہے " وہ سارے کے سارے ہی " ۔ " عَنْ " کے مزید استعمالات ـــ (عربی سیکھنے کے لئے) کسی اچھی ڈکشنری میں دیکھے جا سکتے ہیں اگرچہ اس قسم کے استعمالات قرآن میں نہیں آئے ۔

● زیرِ مطالعہ آیت میں (عَنْھا کا) " عَنْ " فعل " اَزَلَّ " کے ساتھ بطور صلہ آیا ہے جس کا اوپر ۲ : ۲۶ : ۱(۱) میں ذکر کیا گیا ہے ۔ (جس چیز سے ہٹانے کا ذکر ہو اس پر " عَنْ " آتا ہے) اس طرح " ازلّھما ...... عَنْھا " کا ترجمہ ہوگا " ان دونوں کو پھسلا دیا ...... (نے) اس (جنت) سے " اس صورت میں " عنھا " کی ضمیر " جنۃ " کے لیے ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۳۵ (۲ : ۲۵) میں آیا ہے ۔

● اور چونکہ " عَنْ " کے ایک معنی تعلیل (کی وجہ سے) کے بھی ہوتے ہیں ۔ اس لیے بعض مترجمین نے یہاں " عنھا " کا ترجمہ " اس (درخت) کی وجہ سے / کے باعث " بھی کیا ہے ۔ اس صورت میں ضمیر " ھا " کا مرجع " الشجرۃ " ہوگا (دیکھئے ۲ : ۲۵) تاہم اکثر نے " عنھا " کا ترجمہ اس سے ' اس جگہ سے ' وہاں سے " کے ساتھ ہی کیا ہے ۔ البتہ بعض

نے ضمیر کی بجائے اسمِ ظاہر کے ساتھ ترجمہ "جنت سے" کر دیا ہے۔ جو ایک معنیٰ مراد ہی ہو سکتا ہے۔ جب کہ بصورتِ ضمیر کوئی اَور مرجع مراد لینے کی گنجائش موجود رہتی ہے۔

۲:۲۶:۱(۳) [فَاَخْرَجَهُمَا] اس میں تین کلمات ہیں۔ "فاء (ف) بمعنی پس یا سو + اَخْرَجَ (اس نے نکال دیا) + هُمَا (اُن دونوں کو)۔

اس میں سے فعل "اَخْرَجَ" کا مادہ "خ ر ج" اور وزن "اَفْعَلَ" ہے۔ یعنی یہ اس مادہ سے باب اِفعال (اَخْرَجَ يُخْرِجُ اخراجًا ' نکالنا) سے فعل ماضی کا پہلا صیغہ ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد اور مزید فیہ کے باب اِفعال کے معنی اور استعمال وغیرہ پر البقرہ: ۲۲ یعنی ۲:۱۶:۱(۱۰) میں بات ہو چکی ہے۔ قرآن کریم میں فعل مجرد (خرج یخرج = نکلنا) سے افعال کے مختلف صیغے ۵۴ جگہ اور مصدر و اسماء مشتقہ کے بھی مختلف صیغے دس کے قریب مقامات پر وارد ہوئے ہیں۔ اور باب اِفعال سے افعال کے صیغے سو سے زائد جگہ اور مصدر و مشتق اسماء بھی ۱۲ سے زائد جگہ آئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس مادہ (خرج) سے مزید فیہ کے باب اِستفعال سے بھی فعل کے چار صیغے آئے ہیں۔ ان کے معنی وغیرہ پہ اپنی جگہ بات ہو گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● "فَاَخرجهما" میں "اخرج" کے عام بنیادی معنی تو "نکالا یا نکال دیا" ہی ہیں۔ تاہم بعض مترجمین نے مفہوم میں زور پیدا کرنے کے لیے "الگ کر دیا، نکلوا دیا، نکلوا چھوڑا اور نکلوا کر چھوڑا" سے ترجمہ کیا ہے۔ (نکلوانا" اس لیے کہ شیطان نے خود تو نہیں نکالا بلکہ نکالے جانے کا سبب بنا تھا) ان ترجموں میں اردو محاورے کا زور تو ضرور موجود ہے۔ اور سیاق و سباق آیت (قصہ) کے لحاظ سے بھی مفہوم درست ہے۔ تاہم یہ لفظی سے زیادہ تفسیری ترجمہ ہے۔

۲:۲۶:۱(۴) [مِمَّا كَانَا فِيهِ] اس عبارت کے تینوں حصوں ("مِمَّا" "كَانَا" اور "فِيهِ") کی الگ الگ تشریح یوں ہے۔

(۱) "مِمَّا" دراصل "مِنْ" (میں سے) اور "مَا" (جوکہ) کا مرکب ہے (دیکھئے البقرہ ۳ یعنی ۲:۲:۱ (۵) میں) اس کا عام ترجمہ تو "اس میں سے جوکہ/جس" بنتا ہے۔ البتہ بعض مترجمین نے "اس" اور "میں سے" کے درمیان بعض تفسیری الفاظ کا اضافہ کر دیا ہے مثلاً "اس (عزت و راحت) میں سے جس" یا "اس (مزے) میں سے جوکہ" یا "اس (عیش ونشاط) میں سے جس..." یا "اس (آرام) میں سے جس....." کی صورت میں ـــ اسی لیے بعض مترجمین نے زائد تفسیری الفاظ سے بچتے ہوئے اور "مَا" میں بلحاظ سیاقِ عبارت کسی "جگہ" کا مفہوم دیکھ کر "مِنْ مَا" کا ترجمہ "وہاں سے جہاں کہ" کی صورت میں بھی کیا ہے۔ جبکہ بعض نے لفظی ترجمہ سے قریب رہتے ہوئے "اس میں سے جس" کی صورت میں ہی رہنے دیا ہے۔

(۲) "کَانَا" کا مادہ "ک و ن" اور وزن اصلی "فَعَلَا" ہے۔ اس کی شکل اصلی "کَوَنَا" تھی جس میں "واو متحرکہ ماقبل مفتوح" الف میں بدل کر لکھی اور بولی جاتی ہے۔ یہ اس مادہ سے فعل مجرد (کان یکونِ : ہونا) سے فعل ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر ہے۔ "کان" کے باب معنی اور استعمال پر البقرہ : ۱۰ یعنی ۲:۸:۱ (۱۰) میں بات ہو چکی ہے۔

● اس طرح "کانا" کا ترجمہ ہوا "وہ دونوں تھے"۔ یہاں "کانا" فعل مذکر اس لیے آیا ہے کہ یہ صیغۂ تثنیہ آدم اور اس کی بیوی یعنی ایک مرد اور ایک عورت کے لیے ہے۔ اور عربی زبان میں جب مذکر مؤنث ملے جلے مراد ہوں تو اسم یا فعل کا صیغہ ہمیشہ مذکر والا آتا ہے۔ مثلاً کہیں گے "الرجلُ و المرأۃ صالحانِ" (مرد اور عورت نیک ہیں) یا "الرجلُ والمرأۃ ذَہَبا" (مرد اور عورت گئے)۔ [مندرجہ بالا آیات میں جہاں جہاں تثنیہ مذکر کے صیغے مثلاً "کُلا"، "شئتما"، "لا تقربا"، "فتکونا" آئے ہیں۔ وہ اسی قاعدے کے تحت آئے ہیں] اور اسی قاعدے سے

کے مطابق قرآن کریم میں مَردوں کو بصیغہ جمع مذکر دیئے گئے تمام احکام میں عورتیں بھی شامل سمجھی جاتی ہیں۔ جبکہ بصیغۂ جمع (یا واحد و تثنیہ) مؤنث بیان کردہ احکام صرف عورتوں کے لیے ہوتے ہیں۔ عربی زبان کا یہ اصول بہت سے قرآنی احکام کے فہم میں مدد دیتا ہے۔

قریبًا تمام مترجمین نے یہاں " کانا " کا ترجمہ " وہ تھے " سے ہی کیا ہے۔ صرف ایک دو نے "رہتے تھے" کیا ہے جو مفہوم کے لحاظ سے درست سہی مگر اصل " لفظ " سے ذرا ہٹ کر ہے۔

(۳) " فِیْہِ " جو فِیْ (میں) اور " ہٗ " (اس) کا مرکب ہے، کا ترجمہ تو ہے " اس میں " مگر اس میں ضمیر " ہٗ " گزشتہ " مِمَّا " کے " ما " کے لیے ضمیر عائد ہے۔ اس لیے اس کا اردو ترجمہ " اس " کی بجائے " جس میں " ہوگا۔

● اس طرح اس پوری زیرِ مطالعہ عبارت (مِمَّا کانا فیہ) کا ترتیب وار لفظی ترجمہ بنتا ہے " اس میں سے جو کہ وہ دونوں تھے جس میں "۔ ذرا سلیس ترجمہ " اس میں سے جو کہ وہ دونوں تھے " اور بیشتر مترجمین نے یہی ترجمہ یا " جس میں تھے اس میں سے " اختیار کیا ہے۔ البتہ بعض نے " اس یا جس " اور " میں " کے درمیان بعض تفسیری کلمات (عزت و راحت، مزے، عیش و نشاط یا آرام وغیرہ) کا اضافہ کر ڈالا ہے جس پر تبصرہ اوپر گزرا ہے۔

[وَقُلْنَا] میں " وَ " بمعنی " اور " ہے اور " قُلْنَا " (ہم نے کہا) کے مادہ، وزن، باب، معنی اور اس میں ہونے والی تعلیل (قَوَلْنا سے قُلْنا) پر ابھی اوپر ۲ : ۲۵ : ۱ (۱) میں اور اس سے پہلے البقرہ : ۸ یعنی ۲ : ۷ : ۱ (۵) میں مفصل بات ہو چکی ہے۔

۲ : ۲۶ : ۱ (۵) [اِھْبِطُوْا] کا مادہ " ھ ب ط " اور وزن " اِفْعِلُوْا " ہے جس کا ابتدائی ہمزۃ الوصل پیچھے (قلنا کے ساتھ)

ملنے کی بناء پر تلفظ سے ساقط ہو جاتا ہے ۔ اس مادہ (ھبط) سے فعل مجرد "ھَبَطَ یَھبِطُ ھُبُوطاً (باب ضرب سے) کے بنیادی معنی "کسی اونچائی سے نشیب کی طرف جانا" ہیں ۔ جسے مختصراً "نیچے جانا، نیچے اترنا، لڑھک جانا" سے تعبیر کر سکتے ہیں ۔ اور یہ فعل جسمانی یا معنوی دونوں طرح کی "پستی" کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً "ھبط من الطائرۃ" (وہ ہوائی جہاز سے بذریعہ پیراشوٹ نیچے آیا) ـــ جدید عربی میں پیراشوٹ کو "مِھْبَطَۃٌ" (نیچے آنے کا آلہ) کہتے ہیں ـــ یا مثلاً "ھبَط من منزلتہ" (وہ اپنے درجے سے نیچے گر گیا) ۔ پھر یہ فعل بطور محاورہ "کم ہونا" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً "ھبَط الثمنُ" (قیمت کم ہو گئی) یا "ھبَطتْ دَرَجۃُ الحرارۃِ" (درجۂ حرارت یعنی گرمی کم ہو گئی) ۔ تاہم اس قسم کے استعمالات قرآن میں نہیں آئے ۔

● بنیادی طور پر یہ (ھبَط) فعل لازم ہے تاہم فعل "جاءَ" کی طرح کبھی "اترنے یا جانے کی جگہ کا ذکر اس کے ساتھ بطور مفعول بنفسہ (منصوب ہو کر) آتا ہے مثلاً "ھبَط المکانَ" کے معنی "جگہ میں داخل ہونا یا جا رہنا" ہوتے ہیں اور "ھبَط السوق" بازار میں آنا" کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ کبھی یہ بطور فعل متعدی بھی آتا ہے اور اس کے معنی "اتارنا، نیچے لے جانا، کم کرنا" ہوتے ہیں مثلاً کہہ سکتے ہیں "ھبط الثمنَ" (اس نے قیمت کم کر دی) تاہم قرآن کریم میں اس فعل کا بطور متعدی اس طرح کا استعمال بھی کہیں نہیں آیا ۔

● قرآن کریم میں اس فعل سے ماضی، مضارع، امر وغیرہ کے مختلف صیغے کل آٹھ جگہ آئے ہیں ۔ اور ہر جگہ اس کا استعمال بطور فعل لازم یعنی "اتر جانا، نیچے جانا، یا صرف "چلے جانا" کے معنی میں ہی آیا ہے ۔ اس کے مزید فیہ سے بھی قرآن کریم میں کوئی فعل یا اسم وغیرہ استعمال نہیں ہوا ۔ اگرچہ عربی زبان میں مزید فیہ کے بعض ابواب سے بھی افعال مختلف معنی کے لیے استعمال ہوتے ہیں ۔

زیرِ مطالعہ کلمہ " اھبطوا " اس فعل مجرد سے فعل امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے یعنی "تم سب نیچے چلو یا چلے جاؤ"۔ صیغہ مذکر کے خطاب میں مؤنث بھی شامل ہے۔

۲:۲۶:۱(۶) [**بَعْضُكُمْ**] اس میں آخری " كُمْ " تو ضمیر مجرور بمعنی " تمہارا " ہے۔ اور کلمہ " بَعْضٌ " کا مادہ " ب ع ض " اور وزن " فَعْلٌ " ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد بعَض یبعَضُ (مچھروں کا کاٹنا) اور بعِض یبعَض (مچھروں والا ہونا) پر البقرہ : ۲۶ یعنی ۲:۱۹:۱(۳) میں لفظ " بعوضۃ " کے ضمن میں بات ہوئی تھی۔

● اسی مادہ سے ایک فعل " بعَضَ الشَّیْءَ " (باب فتح سے) بمعنی "کسی چیز کی قسمیں بنانا " آتا ہے[1] اور باب تفعیل سے " بعَّضہ " کے معنی بھی "اس کے حصے بنانے" ہوتے ہیں۔ تاہم اس مادہ سے کسی قسم کا کوئی فعل قرآن کریم میں نہیں آیا۔ البتہ لفظ " بَعْضٌ " (جو ایک لحاظ سے اس فعل مجرد کا مصدر بھی ہے ـــــ "کچھ حصہ" کوئی ایک یا چند ایک" (Some) کے معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ عموماً مضاف ہو کر آتا ہے اور اس کا مضاف الیہ ہمیشہ جمع اور معرفہ (عموماً معرف باللام یا کوئی اسم ضمیر) ہی ہوتا ہے۔ مثلاً " بعضُ الملوكِ " جس کا لفظی ترجمہ " بادشاہوں کے بعض (یا کوئی ایک یا چند ایک) " ہونا چاہیے مگر بامحاورہ اردو میں اس کا ترجمہ " بعض بادشاہوں " ہی کیا جاتا ہے۔ بعض نحویوں کا قول ہے[2] کہ " بعض " پر لام تعریف نہیں آسکتا کیونکہ یہ ہمیشہ کسی اسم معرفہ کی طرف مضاف ہوتا ہے حتّٰی کہ جب مضاف نہ بھی ہو تو بھی ایک طرح سے اس کا مضاف الیہ محذوف ہوتا ہے یا سمجھا جاتا ہے۔

● اس طرح زیرِ مطالعہ ترکیب (بعضُکم) کا بلحاظ اضافت ترجمہ " تم کا

---

[1] المعجم الوسیط تحت مادہ " بعض "۔

[2] اگلا صفحہ ملاحظہ فرمائیں

کوئی" یا "تم کے چند" ہونا چاہیے۔ جسے اردو محاورہ کے مطابق "تم میں سے بعض (یا کوئی یا چند)" کہیں گے۔ اس لفظ (بعض) کا عربی استعمال بڑی حد تک انگریزی لفظ Some کی طرح ہے جو ضمائر کے ساتھ تو مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے " Some of you " میں ہے۔

"بعض" سے مراد دراصل کسی چیز کا کچھ حصہ (یعنی اس کے اَبْعاض میں سے ایک) ہوتا ہے زیادہ ہو یا کم۔ اس لیے "بعض" واحد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور جمع کے لیے بھی۔ اس طرح "بعضُکم" کا ترجمہ "تم میں سے کوئی ایک" بھی ہو سکتا ہے اور "تم میں سے چند یا کچھ" بھی۔ سیاق وسباقِ عبارت سے "بعض" کے لیے واحد یا جمع کے معنی کا تعین ہو سکتا ہے۔ زیرِ مطالعہ آیت میں بظاہر یہ (بعض) بمعنی جمع ہی آیا ہے یعنی "تمہارے بعض یا بعضے" کی صورت میں اور قریباً تمام ہی مترجمین نے جمع کے مفہوم میں ہی ترجمہ کیا ہے۔ غالباً صرف ایک مترجم نے بصورت واحد (ایک تمہارا) ترجمہ کیا ہے تاہم اس کا بامحاورہ ترجمہ اگلے مرکب (لبعض) کے ساتھ مل کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ جیسے کہ ہم ابھی بیان کریں گے۔

[لِبَعْضٍ] میں "لام" (لِ) اضافت یعنی "کا، کے، کی" کے معنی میں آیا ہے جیسے نکرہ مضاف میں کہتے ہیں "ابنٌ لَهٗ" (اس کا ایک بیٹا) یا جیسے جملہ "لَهٗ ابنٌ" (اس کا ایک بیٹا ہے) میں ہے۔ اس طرح "لِبَعْضٍ" کا مطلب ہوا "بعض یا کسی کا" [اوپر ہم نے بیان کیا ہے کہ "للبعض" کہنا درست نہیں ہے۔ دراصل "لبعضٍ" "لِبَعْضِکُم" کی جگہ آیا ہے یعنی اس کی تنوین اضافت کے عوض میں آئی ہے جسے تنوینِ عوض بھی کہتے ہیں]

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس پر مزید بحث اور فریقین کے دلائل کے لیے کسی اچھی معجم (ڈکشنری) کی طرف رجوع کریں۔ ویسے "البستان" میں بھی اس پر مختصر مگر جامع بحث کی گئی ہے۔

● اس طرح اس ترکیب " بعضُکم لبعضٍ " کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے " تمہارا کوئی ایک / یا تمہارے بعض (چند) کسی بعض (ایک یا چند) کے "۔ پھر اس کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ ہو گا " تم (باہم) ایک دوسرے کے " یا " تم (آپس میں) ایک دوسرے کے " ـــــ اور بیشتر مترجمین نے یہی بامحاورہ ترجمہ اختیار کیا ہے۔

۲:۲۶:۱(۷) [عَدُوٌّ] کا مادہ " ع د و " اور وزن اصلی " فَعُوْلٌ " ہے اس کی اصل صورت " عَدُوْوٌ " تھی جس میں ساکن اور متحرک واو کے مُدغم ہونے سے " تشدید " پیدا ہوئی ہے ۔

اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد " عدا یَعدُوْ (دراصل عدَوَ یَعْدُوُ) عَدْوًا " (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی تو ہیں: " دوڑنا، دوڑ لگانا یا دوڑتے جانا " ـــــ پھر اس سے اس فعل میں " (کسی حد سے) بڑھ جانا، تجاوز کر جانا " کے معنی پیدا ہوتے ہیں ۔ کبھی اس کے ساتھ " علی " کا صلہ بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً " عدا علیہِ " کے معنی ہیں : " اس نے اس پر زیادتی کی (یعنی ظلَمہ) ۔ اسی طرح " عن " کے صلہ کے ساتھ " عدا عَنْہ " کے معنی ہیں : " اس سے آگے بڑھ گیا یا اسے چھوڑ دیا "۔ ـــــ اور کبھی کسی صلہ کے بغیر اپنے اصل معنی (حد سے بڑھنا) کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔

● قرآن کریم میں یہ فعل مجرد صلہ کے بغیر دو جگہ (النساء : ۱۵۴ اور الاعراف : ۱۶۳) اور " عَنْ " کے صلہ کے ساتھ بھی ایک جگہ (الکھف : ۲۸) استعمال ہوا ہے۔ ـــــ مگر " علی " کے صلہ کے ساتھ کہیں نہیں آیا ۔ اور مزید فیہ کے بعض ابواب (مثلاً مفاعلہ، تفعّل اور افتعال) سے بھی افعال کے مختلف صیغے بیس کے قریب مقامات پر آئے ہیں ۔ اور مشتق و جامد اسماء اور مصادر ساٹھ سے زیادہ جگہ وارد ہوئے ہیں ۔

● زیر مطالعہ لفظ (عَدُوٌّ) اس مادہ (ع د و) سے بظاہر اسم مبالغہ کا ایک صیغہ ہے یعنی بہت زیادہ حد سے گزر جانے والا۔ تاہم یہ بطور اسم صفت استعمال نہیں ہوتا (جیسا کہ اسمائے مبالغہ عموماً استعمال ہو سکتے ہیں)۔ اس کا اردو ترجمہ "دشمن" ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ واحد جمع اور مذکر مؤنث کے لیے یکساں رہتا ہے یعنی "هُوَ عَدُوٌّ / وهم عَدُوٌّ / وهي عَدُوٌّ" کہہ سکتے ہیں البتہ تثنیہ کے لیے "عدوّانِ" اور کبھی مؤنث کے لیے "عدوّةٌ" بھی استعمال ہوتا ہے (قرآن کریم میں نہ تثنیہ کا صیغہ آیا ہے نہ مؤنث کا)۔ اور اس کی جمع مکسر "اَعْدَاءٌ" ہے جو قرآن کریم میں بھی استعمال ہوئی ہے۔ قرآن کریم میں لفظ "عدوّ" ۴۴ جگہ (واحد اور جمع دونوں معنی میں) اور لفظ "اعداء" سات جگہ استعمال ہوا ہے۔ دشمنی کے لیے عربی میں لفظ "عداوة" ہے (اور یہ بھی قرآن میں معرفہ نکرہ کل چھ دفعہ آیا ہے)۔ اور "دشمنی رکھنا یا کرنا" کے لیے فعل باب مفاعلہ سے "عادَی یُعادِی" قرآن کریم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہ سب چیزیں اپنے اپنے موقع پر زیر بحث آئیں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

[وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ] یہ دراصل پانچ کلمات (حروف اور اسماء) کا مرکب ہے یعنی "وَ" (اور) + "لِ" (کا یا کے لیے) + "کُمْ" (تمہارے، تمہارا) + "فی" (میں) + "الارض" (زمین)۔ ان سب کلمات کے معانی اور استعمال پر پہلے بات ہو چکی ہے [اگر اب بھی ضرورت سمجھیں تو "وَ" کے لیے ۱:۴:۱(۳) اور ۲:۷:۱(۱) "لام (لِ)" کے لیے ۱:۲:۱(۴) "کُمْ" (ضمیر منصوب و مجرور) کے لیے عربی گرامر کی کسی ابتدائی کتاب "فی" کے لیے ۲:۱۴:۱(۴) اور "الارض" کے لیے ۲:۹:۱(۴) کی طرف رجوع کیجئے] اس طرح اس عبارت (ولکم فی الارض) کا ترجمہ ہوگا "اور تمہارا/تمہارے لیے زمین میں"۔ اس کی مزید وضاحت باقی عبارت کے ساتھ حصہ "الإعراب" میں آئے گی۔

۲ : ۲۶ : ۱(۸) [مُسْتَقَرٌّ] کا مادہ "ق ر ر" اور وزن "مُسْتَفْعَلٌ" ہے یعنی دراصل "مُسْتَقْرَرٌ" (صیغۂ اسم مفعول جس کی وضاحت آگے آرہی ہے) تھا جس میں "راء مفتوحہ" کی حرکت فتحہ (ـَـ) ماقبل حرف ساکن (ق) کو دے کر دونوں "راء" مدغم ہو جاتی ہیں۔

اس مضاعف مادہ (قرر) سے فعل مجرد "قَرَّ یَقِرُّ قَرَارًا (باب ضرب سے) آتا ہے تو اس کے معنی "(کسی جگہ) ٹک جانا، ٹھکانا پکڑنا، ٹھہر جانا" ہوتے ہیں۔ اور "قَرَّ یَقَرُّ قَرًّا" (باب نصر سے اور فتح سے) آئے تو اس کے معنی "ٹھنڈا ہونا" ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے کچھ صیغے کل چار جگہ آئے ہیں اور ہر جگہ مؤخر الذکر معنی (ٹھنڈا ہونا) والے معنی کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ عربی میں تو اس فعل (قَرَّ یَقَرُّ) بعض اور معانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور مذکورہ بالا (ٹھنڈا ہونا) والے معنی بھی حسی ٹھنڈک (مثلاً دن یا رات کا ٹھنڈا ہونا) اور معنوی ٹھنڈک (مثلاً خوشی۔ آنکھوں کی ٹھنڈک) دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں چاروں جگہ یہ صرف معنوی ٹھنڈک کے لیے ہی استعمال ہوا ہے۔

اس کے علاوہ اس مادہ سے مزید فیہ کے ابواب اِفعال اور استفعال سے بھی اَفعال کے کچھ صیغے پانچ جگہ اور اس مادہ سے متعدد اسماء مشتقہ وغیرہ کے مختلف صیغے ۲۷ جگہ قرآن کریم میں آئے ہیں۔ جن پر اپنے اپنے موقع پر بات ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیر مطالعہ لفظ "مُسْتَقَرٌّ" اس مادہ (قرر) سے باب استفعال کا صیغہ اسم المفعول ہے۔ باب استفعال سے اس کے فعل "اِسْتَقَرَّ یَسْتَقِرُّ اِسْتِقْرَارًا" کے معنی ہیں: کسی جگہ اچھی طرح ٹک جانا یا ٹھکانہ پالینا" یہ فعل ویسے تو لازم ہے اور اس سے اسم المفعول کا صیغہ نہیں بننا چاہیے۔ تاہم چونکہ مزید فیہ میں اسم ظرف کے لیے بھی اسم مفعول ہی کا صیغہ استعمال ہوتا ہے اس لیے یہاں

" مستقَر " اسم ظرف کے طور پر آیا ہے جس کے معنی " ٹھکانا " یا " جائے قرار " بنتے ہیں ۔ ـــــــ اور یہی صیغہ (اسم مفعول) مزید فیہ میں مصدر میمی کا کام بھی دیتا ہے ۔ اس لیے " مستقَر " کا ترجمہ " استقرار " کی طرح " ٹھکانہ پانا بھی ہو سکتا ہے ۔

۲ : ۲۶ : ۱ (۹) [وَمَتَاعٌ] میں " وَ " تو عاطفہ بمعنی " اور " ہے ـــ اور لفظ " مَتَاعٌ " کا مادہ " م ت ع " اور وزن " فَعَالٌ " ہے ۔ اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد " متَع یمتَع متُوعًا " (باب فتح سے) آتا ہے اور اس کے معنی : " دراز ہونا اور کمال کو پہنچنا ، عمدہ ہونا اور شدت اختیار کرنا " ہوتے ہیں ۔ قرآن کریم میں اس فعل سے کوئی صیغہ کسی معنی میں بھی استعمال نہیں ہوا ۔ البتہ مزید فیہ کے ابواب تفعیل ، تفعل اور استفعال سے مختلف افعال ۳۵ کے قریب مقامات پر آئے ہیں ۔ جن پر حسب موقع بات ہوگی ۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ۔

● زیر مطالعہ لفظ " مَتَاعٌ " اسی مادہ (متع) سے ماخوذ ایک اسم جامد ہے جو باب تفعل کے مصدر " تمتُّع " (فائدہ اٹھانا) کے معنی بھی دیتا ہے اور مختلف ضروریات زندگی (روٹی کپڑا مکان سامان وغیرہ) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ، یعنی وہ تمام اشیاء جن سے انسان کچھ فائدہ اٹھاتا ہے ان کو استعمال کرتا ہے اور ان کے حاصل کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے ۔ اور اس سے مراد فانی اور ناپائدار قسم کا نفع اٹھانا ہوتا ہے یعنی چند روزہ استعمال کی اشیاء ۔ اس لیے " متاع " کے معنی " سامان " کے بھی ہوتے ہیں جس میں گھریلو سامان ، سامانِ تجارت اور سامانِ سفر سب شامل ہیں ـــ لفظ " متاع " مفرد مرکب مختلف صورتوں میں قرآن کریم کے اندر ۳۵ جگہ آیا ہے ۔ جن کا مطالعہ اس لفظ کے مختلف معانی سمجھنے میں بھی مدد دے گا ۔

۲ : ۲۶ : ۱ (۱۰) [اِلٰی حِیْنٍ] یہ " اِلٰی " (حرف الجرّ) اور " حِیْن " (بمعنی وقت) کا مرکب ہے۔ ان دونوں کلمات کی بناوٹ اور معنی و استعمال کی الگ الگ تفصیل یوں ہے :

- [اِلٰی] مشہور حرف الجر ہے جو بلحاظ ساخت تین حروف " ا ل ی " پر مشتمل ہے۔ اس مادہ (ا ل ی) سے اور مادہ " ا ل و " سے (جو بابِ سَمِعَ میں آکر " ا ل ی " کی طرح استعمال ہوتا ہے)۔ کچھ فعل (مجرد اور مزید فیہ) بھی استعمال ہوتے ہیں جن میں سے بعض قرآن کریم میں بھی (آگے چل کر ہمارے سامنے) آئیں گے۔

- یہ حرف (الی) ہمیشہ (یعنی قرآن میں اور قرآن سے باہر بھی) اسی املاء (یعنی آخر پر " ی ") کے ساتھ لکھا جاتا ہے اگرچہ پڑھا الف کے ساتھ (" اِلَا " کی طرح) جاتا ہے۔ البتہ ضمیروں کے ساتھ یہ یائے لینہ کے ساتھ (بصورت " اِلَیْ " پڑھا جاتا ہے۔

- " اِلٰی " کا اردو ترجمہ عموماً " تک " کر لیا جاتا ہے۔ تاہم بلحاظ استعمال یہ حسب موقع مختلف مفہوم دیتا ہے۔ ان میں سے اہم استعمال حسب ذیل ہیں:

(۱) زیادہ تر یہ " انتہاء الغایہ " کے معنی دیتا ہے یعنی اس میں کسی وقت (زمان) یا جگہ (مکان) کی " حد تک " کا مفہوم ہوتا ہے۔ گویا کسی سفر یا انتظار یا کسی حکم کی آخری زمانی یا مکانی حد کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسے " البقرہ : ۱۸۸ " میں " الی اللیل " (رات تک) اور " الاسراء : ۱ " میں " الی المسجد الاقصی " (مسجد اقصی تک)۔ پھر اس میں اہل علم کے درمیان ایک مشہور بحث (اور اختلاف) یہ ہے کہ " الی " کے بعد بیان کردہ " وقت یا جگہ " کا کچھ حصہ بھی اس " الی " کے ذریعے بیان کردہ حد میں داخل سمجھا جائیگا یا وہ اس سے باہر سمجھا جائے گا۔ ایک عام اصول یہ ہے کہ اگر " الی " کے بعد بیان کردہ چیز بھی اس سے پہلے والی چیز (وقت یا جگہ) کی ہی جنس سے ہو

تو وہ (بعد والی چیز) بھی اسی پہلی چیز میں داخل سمجھی جائے گی ورنہ (غیر جنس ہونے کی صورت میں) اس سے خارج سمجھی جائے گی۔ بعض فقہاء اسی اصول پر روزے والے حکم " ثم اتموا الصیام الی اللیل " (البقرہ:۱۸۸) " رات کچھ بھی حصہ " کو روزہ کے حکم سے باہر سمجھتے ہیں اور وضو کے حکم میں " وایدیکم الی المرافق " (المائدہ : ۶) کے معنی میں " کہنیوں " کو بھی ہاتھوں کو دھونے کے حکم میں داخل سمجھتے ہیں ۔

بہرحال اس (" انتہاء الغایہ " یا " انجام مقصود ") والے معنی کے لیے " اِلیٰ " کا ترجمہ عموماً " ...... تک " یا " ..... کی طرف " کیا جاتا ہے

(۲) کبھی یہ (الیٰ) مصاحبت یا معیت (ساتھ ہی واقع ہونا) یعنی " مَعَ " کے معنی دیتا ہے جیسے " ..... الی اموالکم " (النساء : ۲) میں آیا ہے۔ اس صورت میں " الیٰ " کا اردو ترجمہ " کے ساتھ (ملا کر) " کیا جائے گا اور کبھی اس کا ترجمہ " ..... کے ساتھ (مل کر) " بھی کیا جا سکتا ہے جیسے " .... مَنْ انصاری اِلی اللہ " (الصف : ۱۴) میں آیا ہے۔ بہرحال دونوں جگہ " الیٰ " کا مفہوم " مَعَ " والا ہے ۔

(۳) کبھی " اِلیٰ " بمعنی " عندَ " استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا اردو ترجمہ " ...... کے نزدیک " " ...... کے پاس " یا " .... کے ہاں " کرنا ہی مناسب ہوتا ہے عموماً یہ معنی محبت یا بغض کے مضمون میں " الیٰ " کے مجرور کی فاعلیت (بلحاظ بغض یا محبت) کی وضاحت کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ جیسے " رَبِّ السجنُ احبُّ اِلیَّ ..... (یوسف : ۳۲) میں آیا ہے ۔

(۴) کبھی یہ لام الجر " (لِ) " کے معنی دیتا ہے جس کا اردو ترجمہ حسب موقع " ...... کے لیے " یا " ..... کے حوالے (..... کے ہاتھ میں) " کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً " اذا قمتم الی الصلوۃ ..... (المائدہ : ۶) میں یہ

"...... کے لیے" کے معنی میں ہے اور " والامر الیکِ (النحل: ۳۳) میں "تیرے حوالے یا تیرے ہاتھ میں" کے معنی دیتا ہے۔

(۵) کبھی یہ " فی " (جارہ) کے معنی دیتا ہے۔ اس کی ایک مثال "لیجمعنکم الی یوم القیامۃ " (النساء: ۸۷) میں ہے۔ یہاں " اِلیٰ " کا ترجمہ "میں" ہی کیا جائے گا۔

● مندرجہ بالا استعمالات تو وہ ہیں جن کی مثالیں قرآن کریم میں بھی مل جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ " اِلیٰ " کے بعض خاص محاوراتی (idiomatic) استعمالات بھی ہیں جو اگرچہ قرآن مجید میں تو نہیں آئے مگر عربی دانی کے لئے ان کا جاننا لازمی نہیں تو مفید ضرور ہے لہٰذا ان کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

● ازانجملہ یہ کہ " اِلی " بعض دفعہ اسم الفعل (بمعنی " امر ") کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اس میں بھی یہ کبھی " اُبْعُـد " (دور ہو جا) اور کبھی "خُـذْ " (یہ لو) کے معنی دیتا ہے مثلاً " اِلَیْکَ عَنِّی " کے معنی ہیں "مجھ سے دور رہو" اور " الیکَ الکتـابَ " (یہ لو کتاب) اسی طرح "اِذھب الیکَ " (اپنے کام سے سروکار رکھو یعنی دوسرے میں ٹانگ نہ اڑاؤ) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

[حِیْنٍ] اس کا مادہ "ح ی ن " اور وزن " فِعْلٌ " ہے (عبارت میں یہ "الی" کی وجہ سے مجرور آیا ہے)۔

اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد " حَان یحِیْنُ حَیْنًا (باب ضرب سے) استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی : "(کسی چیز کا وقت) قریب آلگنا یا ہو جانا" ہوتے ہیں مثلاً کہیں گے " حان وقت الصلوۃ " (نماز کا وقت ہو گیا) تاہم قرآن میں اس مادہ سے کوئی فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔

● لفظ " حِیْنٌ " کے معنی ہیں : "کچھ وقت، کچھ مدت" ۔ تھوڑی ہو یا زیادہ اور مختصر ہو یا طویل۔ اس طرح زیر مطالعہ مرکب " الی حین " کا

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

عورت کے حقوق و فرائض

اور دائرہ کار

ـــــــــــــــــــ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عورت کے حقوق و فرائض اور مقام حیثیت کے تعین میں ہمیشہ افراط و تفریط سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ کبھی تو اسے اوج ثریا تک رفعت دی گئی اور کبھی تحت الثریٰ کے قعر مذلت میں دھکیل دیا گیا۔ کبھی عورت کو سخت پردہ کا پابند خیال کیا گیا اور کبھی پردہ کی پابندی کو قید تصور کر کے عورت کو آزادانہ اپنی دلکشی اور بناؤ سنگھار کی نمائش کے قابل سمجھا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ رومن ایمپائر اپنے وقت کی متمدن ترین سلطنت تھی۔ اس وقت رومانی عورتیں گھریلو کام کاج میں گہری دلچسپی لیتی تھیں جب کہ گھر کے باہر کی تمام مصروفیات مردوں کے ذمہ تھیں۔ وہ شدید ضرورت کے تحت گھر سے باہر نکلتیں اور اس وقت بھی سخت پردے کا اہتمام کرتیں۔ یہاں تک کہ جو عورت دایہ گری کا کام کرتی تھی وہ بھی اپنے گھر سے نکلتے وقت بھاری نقاب سے اپنا چہرہ چھپائے ہوتی اور پھر اوپر ایک موٹی چادر اس طرح اوڑھتی کہ شکل کا نظر آنا تو کیا جسم کی بناوٹ کا بھی پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ اس دور میں رومن قوم نے علوم و فنون میں کمال حاصل کیا اور فتوحات ملکی اور عظمت و کمال میں پوری دنیا پر تفوق حاصل کیا۔ بعد ازاں وقت آیا کہ عورتوں کے پردہ اور قرار فی البیت کو قید تصور کیا جانے لگا، عورتیں گھروں سے نکل کر بیرون خانہ مردوں کے شانہ بشانہ مصروف کار ہو گئیں، ذکور و اناث میں اختلاط ہوا، عورت کی حیا ختم ہوئی، عصمت جاتی رہی بلکہ وقار بھی نہ رہا۔ وہ بازاری مال قرار پائی۔ سات پردوں میں مستور رہنے والیوں نے نیم عریاں لباس میں ناچنے اور گانے کا مشغلہ اختیار کیا اور یوں عورت شمع محفل بن گئی۔ مردوں کی ایک اکثریت لہو و لعب میں پڑ گئی، وہ عورتوں پر جانیں فدا کرنے لگے۔ ایوان سلطنت میں عورت کو رسائی ملی۔ عورت کے معمولی اشارے پر بڑے بڑے عہدیدار معزول کر دیئے جاتے۔ گویا عورت کی خوشنودی مرد کا مقصد حیات اور مطمح

نتفر کھری۔ یہ حالت ہوئی تو رومن ایمپائر کی بربادی شروع ہوئی۔ اس عظیم سلطنت کا شاندار اور مستحکم محل عورت کے نازک ہاتھوں زمین بوس ہوگیا اور ساری عظمت اور شان وشوکت خاک میں مل گئی۔ عورت فطری طور پر درون خانہ کے امور کی ذمہ دار تھی اور مرد بیرون خانہ کی دوڑ دھوپ کے اہل تھا۔ لیکن قانون فطرت کی خلاف ورزی نے نتیجہ دکھایا اور متمدن اور موقر معاشرہ عریانی اور فحاشی کے ہاتھوں ذلت کے گڑھے میں جا گرا۔ اس وقت کے دانش وروں نے ثابت کیا کہ عظمت کی بلندی کا ادبار کی ذلت میں تبدیل ہونا محض عورتوں کے بیرون خانہ مشاغل میں انہماک اور پردہ ترک کردینے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس کے ردعمل کے طور پر عورت کو ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ عورتوں پر اچھی غذا کھانا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ان کے ہنسنے اور بولنے پر پابندی لگا دی گئی۔ ان کے منہ پر سیر موزنامی قفل چڑھا دیا جاتا اور وہ گفتگو نہ کرسکتیں۔ اگر عورت سے کوئی قصور سرزد ہو جاتا تو اسے انتہائی ذلیل اور بے وقعت مخلوق تصور کرتے ہوئے سخت سے سخت سزا دی جاتی۔ مجرم عورتوں کے جسم پر قطران ٹپکایا جاتا۔ گھوڑوں کے ساتھ باندھ کر گھسیٹی جاتیں۔ بھوکی پیاسی ستونوں کے ساتھ باندھ دی جاتیں اور نیچے آگ روشن کردی جاتی جس کی سوزش سے ان کا گوشت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرتا اور اس طرح سسک سسک کر ان کی جان نکلتی۔ حالت یہاں تک پہنچی کہ سترہویں صدی عیسوی میں روما میں اعلیٰ درجہ کے فاضل اور قابل لوگوں کا اجلاس منعقد ہوا جس میں یہ سوال زیر بحث آیا کہ عورت میں بھی روح ہے یا نہیں۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل عرب میں عورت کو انتہائی بے وقار سمجھا جاتا تھا۔ بیٹی کی پیدائش کو منحوس خیال کیا جاتا' ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے اور ایک مرد جتنی چاہتا عورتیں رکھ سکتا تھا۔ عورت وراثت میں حصہ دار نہ ہوتی تھی۔ بیوہ ہونے کی صورت میں اسے دوسری شادی کی اجازت نہ تھی۔ عیسائیت میں بھی عورت کی کچھ قدرومنزلت نہ تھی پولوس کا مشہور قول ہے کہ دنیا میں گناہ عورت ہی کے ذریعے آیا۔ عورت کو شیطان کا دروازہ بھی کہتے تھے۔ ہندومت میں عورت فساد کی جڑ خیال کی جاتی۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام جھگڑے زر' زمین اور زن سے پیدا ہوتے ہیں لہٰذا ان تینوں پر ذاتی ملکیت ختم کردینی چاہئے یہ سب لوگوں کے استعمال کی مشترک چیزیں ہیں رگ وید

میں لکھا ہے کہ عورتوں سے محبت نہیں ہو سکتی۔ عورتوں کے دل فی الحقیقت بھیڑیوں کے بھٹ ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں اگر شادی شدہ عورت کا شوہر مرجاتا تو اس کی بیوی کو بھی ساتھ ہی چتا میں ڈال کر بھسم کر دیا جاتا۔ گویا ان کے نزدیک عورت کی اپنی ذاتی حیثیت نہ تھی بلکہ وہ مرد کے بغیر زندہ رہنے کا حق بھی نہیں رکھتی تھی۔

اسلام دین رحمت ہے۔ اس میں خالق کائنات الرحیم ہے۔ اس کا رسولؐ رحمت للعالمین ہے۔ اسلام نے مخلوق کی ہر جنس کے حقوق کا تحفظ کیا ہے اور فرائض متعین کئے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے جملہ اصول وضوابط معتدل' متوسط اور فطرت کے قریب ترین ہیں۔ عورت کے مقام و مرتبے کا تعین بھی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مرد اور عورت مل کر خاندان کی آبادی کا باعث بنتے ہیں۔ مرد افراد خانہ کی معاشی اور دفاعی ضروریات کا ذمہ دار ہے جبکہ عورت مرد کو پر سکون گھریلو ماحول میسر کر کے اسے بیرون خانہ کی مصروفیات کے لئے تیار کرتی ہے اور بچوں کی تربیت کا اہم ترین کام انجام دیتی ہے۔ یہی بچے پروان چڑھ کر مفید اور شریف شہری بنتے ہیں اور اس طرح عورت کے ہاتھوں ایک باعظمت وباکردار قوم وجود میں آتی ہے۔

اسلام منضبط زندگی کا قائل ہے۔ یہاں تک کہ اگر دو مسافر مل کر سفر کریں تو اسلامی تعلیمات کے تحت ان میں سے ایک کو امیر سفر کیا جائے گا اور سفر کے دوران دونوں کی ذمہ داریاں طے کر دی جائیں گی۔ اسی طرح خاندان ایک چھوٹا سا معاشرہ ہے۔ اگر اس میں بدانتظامی اور افراتفری پیدا ہو گئی تو قوم وملت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ لہٰذا مرد کو خاندان میں "قوام" کا درجہ دے کر اسے عورت پر امیر مقرر کیا گیا ہے اور ذمہ داریوں کے بار کی وجہ سے اسے ایک گونہ فضیلت دی گئی ہے۔ مرد اگر محسوس کرے کہ عورت کے اخلاقی نقائص حد درجہ کوشش کے باوجود درست نہیں ہوئے اور نہ درست ہونے کی امید ہے تو انتہائی ناگزیر حالات میں وہ اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ طلاق کا یہ اختیار صرف مرد کو ہے۔ اگر عورت اپنے شوہر کے رویہ سے مطمئن نہ ہو تو وہ مامور ہونے کی وجہ سے خود مرد سے علیحدگی اختیار نہیں کر سکتی بلکہ عدالت کی طرف رجوع کر کے اور اپنے موقف کو ثابت کر کے خلع حاصل کر سکتی ہے۔ میاں بیوی کے درمیان تنازعہ کی صورت میں مرد عورت کو راہ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا اور آخری علاج کے طور پر مرد کو

اجازت ہے کہ وہ جسمانی سزا بھی دے سکتا ہے۔ اگر اس طرح اصلاح کی صورت پیدا ہو جائے تو فبہا' ورنہ مرد طلاق کا حق استعمال کر کے عورت کو علیحدہ کر سکتا ہے۔ اگر مرد اور عورت کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے تو گھرانہ سکون و اطمینان کا گہوارہ ہو گا' جس میں مرد کی امارت اور فضیلت اسے اہل خانہ بشمول بیوی کی خدمت پر مامور کرے گی۔ وہ سربراہ خانہ ہونے کے ناطے عورت کو مناسب رہائش کی فراہمی اور لباس وخوراک اور جملہ ضروریات زندگی کے مہیا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ عورت معاشی فکر سے آزاد گھر کی چاردیواری میں پروقار زندگی گزارتی ہے شوہر کی طرف سے اسے محبت اور الفت ملتی ہے جبکہ اولاد اس کی فرمانبردار اور مامور ہوتی ہے۔

خالق کائنات نے ہر چیز کو مخصوص وظیفے کی ادائیگی کے لئے پیدا کیا ہے اور اس کے فرائض منصبی کے مطابق اسے اعضاء وجوارح دیئے ہیں۔ یہ بات تمام مخلوق حتی کہ جانوروں تک میں پائی جاتی ہے شکاری جانوروں کو رفتار کی چستی اور دانتوں کی تیزی دی گئی ہے اونٹ کے پاؤں اس طرح چوڑے اور گدیلے بنائے گئے ہیں کہ وہ اپنے ماحول یعنی صحرائی علاقوں میں آسانی سے باربرداری کے کام آ سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ صحرائی ماحول کے مناسب اس کی جسمانی ساخت اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ ریگستان کی شدید تپش میں کئی کئی دن بغیر پانی پیے گزار سکتا ہے۔

عورت کے فرائض منصبی سہ گونہ ہیں اول مرد کو پرسکون خانگی میسر کرنا' دوم افزائش نسل انسانی' سوم رضاعت و تربیت۔ چونکہ یہ سارے وظائف گھر کی چاردیواری کے اندر رہنے کو کہا گیا' پس جب وہ مرد کی طرح گھر سے باہر کی مصروفیات اختیار کرے گی تو کامیاب نہ ہو سکے گی بلکہ اپنے فطری اور حقیقی وظائف کی ادائیگی میں کوتاہی کا سبب بنے گی۔ اور سوسائٹی کے لئے مشکلات پیدا کرے گی۔ وہ بچہ جس کی تربیت میں ماں نے کاوش نہیں کی اور اس کی تعمیر شخصیت میں کمی رہ گئی ہے وہ غیرمتوازن بچہ معاشرے پر بوجھ ہو گا اس طرح عورت اپنے دائرہ کار سے تجاوز کرنے کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ باعث بنے گی۔ اسی طرح ایک مرد جب اپنس فرائض منصبی یعنی معاشی اور دفاعی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی بجائے گھر کی چاردیواری کے اندر بیٹھا رہے تو فساد کا باعث ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب عورت اپنی درون خانہ مصروفیات کو

چھوڑ کر بیرون خانہ مرد کے دائرہ کار میں کام کرتی ہے تو وہ عورت نہیں رہتی بقول پروفیسر جیوم فریرو نہ وہ عورت رہتی ہے نہ مرد بلکہ ایک تیسری جنس کا نمونہ بن گئی ہے اور مرد کے لئے اس میں کشش باقی نہیں رہتی۔

کہا جاتا ہے کہ عورتوں کو بیرون خانہ کاموں سے روک کر گھر کے اندر بٹھا کر رکھنا نصف کارکن آبادی کو بے کار کرنے کے مترادف ہے ، لیکن یہ بات وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو عورت کے وظائف حقیقی سے نا آشنا ہیں اور جنہیں لاشعوری یا شعوری طور پر ملک وملت کی فلاح عزیز نہیں ۔ کیونکہ عورت گھر کی چاردیواری میں بے کار نہیں ہوتی بلکہ تعمیر ملت کی اہم ذمہ داری ادا کرتی ہے۔ ایسی ذمہ داری کہ اس کی غفلت سے ملت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسی حقیقت کو شاعر مشرق نے اس طرح بیان کیا ہے۔

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے آج پھر عورت کے گھر کی چاردیواری کے اندر رہنے اور پردہ کرنے کی مخالفت ہو رہی ہے۔ مغرب میں عورت بیرون خانہ کے مشاغل میں بھرپور حصہ لے رہی ہے۔ چونکہ مغرب مادی ترقی کے اعتبار سے بہت آگے نکل چکا ہے اس لئے اس کی مادی چمک دمک سے مرعوب ہو کر مسلمانوں نے اس کی پیروی میں عورت کو گھر سے باہر کے مشاغل میں مصروف کرنے کی حمایت اور پردہ ترک کر دینے کی خواہش کا اظہار برملا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ خود مغرب میں اس بات کا احساس شدت پکڑتا جا رہا ہے کہ عورتوں کا بیرون خانہ مردوں کے شانہ بشانہ معاشی جدوجہد میں شرکت نتائج کے اعتبار سے معاشرے کے لئے انتہائی مہلک ثابت ہوا ہے۔ علامہ آگست کاؤنٹ اپنی تصنیف النظام السیاسی میں لکھتا ہے "شوہر یا کسی قریبی رشتہ دار کی عدم موجودگی میں سوسائٹی کا فرض ہے کہ عورت کی ضروریات کا اپنی دولت سے انتظام کرے تاکہ اسے معاشی ضرورت سے مجبور ہو کر گھر سے باہر کی زندگی میں مبتلا نہ ہونا پڑے۔ کیونکہ حتی الامکان عورت کی زندگی کو منزلی دائرے میں محدود رہنا چاہئے اور کوشش ہونی چاہئے کہ عورت خارجی زندگی کے مصائب اور تکلیفوں سے محفوظ رہے اور قدرت نے اسے جس دائرے میں محدود کر دیا ہے اس سے باہر نکلنے پر مجبور نہ ہو۔

عورت کا معنی ہے چھپانے کے قابل۔ اسی طرح لفظ مستورات خواتین کے لئے بولا جاتا ہے جس کا مادہ "ستر" یعنی پوشیدہ ہے۔ گویا عورت کا اولین فرض پردے میں رہنا ہے۔ بعض لوگوں کا استدلال ہے کہ دور نبوی میں عورتوں نے جنگ میں بھی حصہ لیا۔ لہٰذا عورتوں کا گھر سے نکلنا درست ہے لیکن یہ استدلال اول اس اعتبار سے غلط ہے کہ عہد نبوی میں کبھی صحابیات نے بھرپور حصہ نہیں لیا بلکہ چند عورتوں کے انتہائی ہنگامی حالت میں میدان جنگ میں نظر آنے کو معمولی تصور کرنا قرین انصاف نہیں۔ دوم پردے کا حکم ۵ ہجری میں نازل ہوا' اس سے پہلے عورتوں کا بے پردہ چلنا پھرنا حجت نہیں۔ پردہ کا حکم نازل ہونے کے بعد کبھی عہد نبوی یا عہد خلافت راشدہ میں عورتیں بے پردہ نظر نہیں آئیں۔ سوم انتہائی ناگزیر حالات میں عورتوں کو گھر سے باہر جانے کی اجازت ہے لیکن اس طرح کہ وہ اپنی چادریں اوڑھ کر رکھیں۔ غرض عورت کا ننگے منہ بلا پردہ نظر آنا نہ عقل سلیم سے ثابت ہو سکتا ہے اور نہ اسلامی تعلیمات میں اس کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔

مغرب کی مادی ترقی کو اوج کمال پر دیکھ کر بعض نادان مسلمان احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور ہر معاملے می ان کی تقلید میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ طرز عمل سراسر خطا ہے۔ اسلام خود ایک کامل دین ہے اس کی تعلیمات الہامی ہیں اور اقرب الی الفطرت' مادی وسائل کی فراہمی میں مغرب کی ترقی واقعی قابل ستائش بلکہ قابل تقلید ہے لیکن مغربی تہذیب کا وہ تباہ کن پہلو بھی پیش نظر رہنا چاہئے جس نے خود مغربی دانشوروں کو اعتراف حقیقت پر مجبور کر دیا ہے۔ انگریز دانش ور سموئیل سماعت اپنی کتاب "کتاب الاخلاق" میں رقم طراز ہے "جو دستور عورتوں کی دخانی کارخانوں میں کام کرنے کی اجازت دیتا ہے اس سے خواہ ملکی ثروت کتنی ہی کیوں نہ ترقی کر جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس نظام کا نتیجہ حیات منزل کی بنیادیں متزلزل کر دینے والا ثابت ہوا ہے وہ خانہ داری کے طرز زندگی پر حملہ آور ہوا ہے اور اس نے گھرانے اور کنبے کی شاندار عمارت کو منہدم کر کے معاشرت کی بندشیں بالکل توڑ پھینکی ہیں اس حالت نے بیوی کو شوہر اور اولاد کو ان کے رشتہ داروں سے چھین کر ایک ایسی خاص نوعیت اختیار کر لی ہے جس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ عورت کی اخلاقی حالت ابتر ہو جائے۔

کیونکہ عورت کا حقیقی وظیفہ واجبات منزلی کو ادا کرنا تھا۔ اپنے مکان، رہائش کی ترتیب و آراستگی اپنے بچوں کی تربیت اور خانگی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے وسائل معیشت میں انتظام اور کفایت شعاری برتنا، مگر کارخانوں نے عورت کو ان تمام واجبات سے الگ کر دیا ہے۔ اب گھر گھر نہیں رہ گئے اولاد کو تربیت نہیں ملتی۔ وہ لاپروائی کے عالم میں پڑی رہتی ہے میاں بیوی کے درمیان محبت سرد پڑ گئی ہے۔ عورت کی وہ حالت نہیں رہ گئی کہ وہ ایک خوش مزاج بیوی اور مرد کی محبوب مانی جائے بلکہ اب وہ محنت و مشقت برداشت کرنے میں مرد کی مدمقابل اور حریف بن گئی ہے۔

چونکہ یورپ میں عورت گھر سے نکل کر خارجی زندگی میں الجھ گئی ہے اس لئے انتہائی ترقی یافتہ معاشرے میں آرام وسکون یکسر مفقود ہو گیا ہے۔ دماغی امراض میں اضافہ، خودکشی کی بہتات، طلاق کی کثرت نے مغربی معاشرے کو پریشان کر رکھا ہے کیا مغربی سوسائٹی کا یہ حال ہمارے لئے عبرت کا مقام نہیں ہے؟

اگر ہم ایک مسلمان عورت کی تصویر الفاظ میں کھینچنا چاہیں تو یوں سمجھئے کہ مسلمان عورت فکر معاش سے آزاد، زیور تعلیم و تربیت سے آراستہ، باحیا اور خانہ دار عورت ہے اگر وہی بیوی ہے تو شوہر اس کی رہائش خوراک، لباس اور راحت و آرام کا ذمہ دار ہے۔ اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اگر وہ بیٹی ہے تو گویا گھر کی شہزادی ہے بھائیوں کی چہیتی ہے باپ کی لخت جگر ہے باپ اس کی خواہشات کا احترام کرتا ہے کیونکہ اس بات پر جنت کی بشارت ہے اگر ماں ہے تو بیٹوں کے لئے اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے اس کی اطاعت اور خدمت بیٹوں کا فرض ہے وہ اسے آرام و راحت پہنچانے میں اپنی سعادت اور خوش بختی تصور کرتے ہیں مسلمان عورت کو چلچلاتی دھوپ اور کڑاکے کی سردی میں گھر سے باہر دکانوں، کارخانوں یا دفاتر میں کام نہیں کرنا بلکہ ملکہ بن کر گھر گھرہستی کی زندگی گزارنا ہے۔ ہر چیز طلب کرتا ہے جو اسے مہیا کی جائے گی۔ وہ شوہر کی محبت کا مرکز اور آنکھ کا تارا ہو گی۔ اس کی عصمت اور پاک بازی شوہر کی نگاہ میں اس کی قدر و منزلت کو بہت بڑھا دے گی۔ یہی عورت شوہر کے لئے حقیقی سکون فراہم کر سکتی ہے۔ اور اپنی عفیف اور پاکیزگی سے شوہر پر حکومت کر سکتی ہے شوہر قوام ہونے کے باوجود اس کا مامور ہو گا۔

حقوقِ انسانی

قرآن و حدیث کی روشنی میں (۴)

ازقلم: سید شبیر حسین زاہد

(۶) رشتہ داروں کے حقوق:

(ا) حُسنِ سلوک: قرآن کریم میں ارشاد ہوا: **وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ** (البقرہ: ۸۳) "اور ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرو"۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جو شخص فراخ رزق اور لمبی عمر چاہتا ہے وہ اقارب (رشتہ داروں) سے (اچھے) تعلقات استوار کرے"۔ (بخاری)

(ب) صلۂ رحمی: قرآن میں ارشاد ہوا: **وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ** (النساء: ۱) "اور اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم سوال کرتے ہو اور رشتہ داریوں سے (باخبر رہو)"۔ حضور صاحبِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: "اقارب (رشتہ داروں) سے قطعِ تعلق (صلۂ رحمی کا انقطاع) کرنے والا کبھی جنّت میں داخل نہیں ہوگا"۔ (بخاری)

(ج) مالی امداد: قرآن مجید میں حکم ہے: **فَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ** (الروم: ۳۸) "پس قرابت دار کو اس کا حق ادا کرو"۔ یہی حکم سورۃ بنی اسرائیل آیہ ۲۶ میں بھی ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم مکّہ میں اپنی پھوپھیوں کی مالی مدد فرمایا کرتے تھے[۲۰] اور مدینہ میں خیبر کے مال کے دو حصّے مسلمانوں کے اور ایک حصّہ حضورؐ کے اہل و عیال و قرابتداروں کے لئے وقف تھا[۲۱] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ "مسکین کو صدقہ دینا ایک ثواب ہے اور قرابتدار کو صدقہ دینا دوگنا ثواب ہے"۔ (مشکوٰۃ) قربانی کے گوشت میں ایک حصّہ قرابتداروں کا رکھا جاتا ہے جو کہ سنّتِ رسولؐ ہے۔

---

[۲۰] طبقات ابن سعد

[۲۱] سنن ابی داؤد

(د) صحیح راستے کی طرف رہنمائی: حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسری وحی یہ کی گئی: **وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ** (الشعراء: ۲۱۴) "اور اپنے اہلِ خاندان رشتہ داروں کو خبردار کرو"۔

(ہ) تعظیم، شفقت و مہربانی: رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "بڑے بھائی کا حق چھوٹے پر ایسا ہے جیسا باپ کا حق اولاد پر"۔ (بیہقی) پھر فرمایا: "جو ہمارے چھوٹوں پر رحم اور بڑوں کی تعظیم نہ کرے وہ ہمارے طریقے پر نہیں"۔ (ترمذی)۔ "جو لوگوں (یعنی رشتہ داروں) پر مہربانی نہیں کرتا تو خدا بھی اس پر مہربانی نہیں کرتا"۔ (صحیحین)

(و) میراث میں حصّہ: ارشادِ خداوندی ہے: "اور رشتہ دار اللہ کے حکم کے مطابق ایک دوسرے کی میراث کے زیادہ حقدار ہیں"۔ (الانفال: ۷۵)۔ "مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں سے کچھ سلوک کرنا چاہو تو یہ جائز ہے"۔ (الاحزاب: ٦)۔ مزید فرمایا: "مردوں کے لئے حصّہ ہے اس ترکے میں سے جو والدین اور قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لئے بھی حصّہ ہے اس ترکے میں سے جو والدین اور قرابت دار چھوڑ جائیں"۔ (النساء: ۷) پھر سورۃ النساء کی آیات ۱۱، ۱۲ میں اولاد، والدین، زوجین، کلالہ کے (یعنی جس کے نہ والدین زندہ ہوں نہ اولاد ہو) اخیافی بہن بھائیوں اور آیت ۱۷٦ میں (کلالہ کے) سگے اور سوتیلے بہن بھائیوں کا وارثت میں حصّہ بیان فرمایا۔ دوسرے قرابت داروں کے حصوں کی شروط اور تفصیل احادیث میں مذکور ہوئی۔

(۷) یتیموں کے حقوق:

(ا) نیک سلوک: قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے: **وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی....** (النساء: ۳٦) "اور ماں باپ، رشتہ دار اور یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کرو......" ارشادِ نبوی ؐ ہے: "جو کسی یتیم (لڑکی یا یتیم لڑکے) کے ساتھ نیک سلوک کرے گا جو اس کے پاس ہے تو میں اور وہ جنّت میں دو انگلیوں کی طرح اکٹھے ہوں گے"۔ پھر آپؐ نے انگلیوں کو ملا کر دکھایا، پھر فرمایا: "مسلمانوں میں اچھا گھر وہ ہے جس میں اگر کوئی/یتیم ہو تو اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جا رہا ہو۔ اور بُرا (گھر وہ ہے) جس میں یتیم سے بد سلوکی ہو رہی ہو"۔ (ریاض السنۃ)

(ب) یتیموں کی عزت: ارشادِ الٰہی ہے: **کَلَّا بَل لَّا تُکرِمُونَ الیَتِیمَ** (الفجر: ۱۷) "ہرگز نہیں ' بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے ہو"۔ پھر فرمایا: "یتیم کو کبھی نہ جھڑکو"۔ (الضحیٰ: ۹)

(ج) کھانے کی امداد: ارشادِ خداوندی ہے: "اور اس (خدا تعالیٰ) کی محبّت کی وجہ سے (ایمان والے) مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں"۔ (الدہر: ۸) حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "جو شخص مسلمانوں میں سے کسی یتیم کو کھلانے پلانے کے لئے گھر لے جائے گا اللہ اسے جنّت میں داخل کرے گا"۔ (ترمذی)

(د) یتیم کی کفالت: حضورؐ کا ارشاد ہے: "میں اور یتیم کا سرپرست نیز دوسرے محتاجوں کا سرپرست ہم دونوں جنّت میں اس طرح ہوں گے"۔ یہ کہہ کر آپ نے بیچ کی انگلی اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا۔ (بخاری)

(ہ) یتیم کی جائیداد کی حفاظت: اللہ کا فرمان ہے: **وَلَا تَقرَبُوا مَالَ الیَتِیمِ إِلَّا بِالَّتِی هِیَ أَحسَنُ حَتّٰی یَبلُغَ أَشُدَّهٗ** (الانعام: ۱۵۲) "اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو مگر بہترین طریقے سے حتیٰ کہ وہ جوان ہو جائے"۔ اسی مضمون کی آیات سورۃ النساء (رکوع ۱) میں بھی آئی ہیں۔

(و) یتیم لڑکیوں کے حقوق کی رعایت: قرآن میں بیان ہوا ہے: "اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں میں انصاف قائم نہ رکھ سکو گے تو (دوسری آزاد عورتوں میں سے) اپنی خواہش کے مطابق دو دو تین تین چار چار عورتوں سے نکاح کر لو"۔ (النساء: ۳)

(ز) یتیموں کی مالی امداد: ارشادِ الٰہی ہے: "تو آپؐ ان سے کہہ دیں کہ تم جو بھی مال خرچ کرو ماں باپ ' قریبی رشتہ دار ' یتیموں ' محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے ' اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اسے خوب جانتا ہے"۔ (البقرۃ: ۲۱۵) "مالِ غنیمت میں سے پانچواں حصّہ اللہ ' اس کے رسولؐ ' قرابتدار ' یتیموں ' محتاجوں اور (بدحال) مسافروں کا حق ہے"۔ (الانفال: ۴۱)

(ح) یتیم کی خیر خواہی: حکمِ الٰہی ہے: "لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں دریافت

کرتے ہیں تو آپ ان سے کہہ دیں کہ ان کی اصلاح کرنا بہتر ہے اور اگر تم ان سے مل جُل کر رہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں "۔ (البقرہ: ۲۲۰)

(ط) یتیموں کے حقوق کے سلسلے میں انصاف پر قائم رہنے کی تاکید: سورۃ النساء (آیت ۲۱۷) میں ارشاد ہوا ہے: "اور یہ کہ یتیموں کے لئے انصاف پر قائم رہو"۔

(۸) پڑوسی کے حقوق:

(ا) حُسنِ سلوک: ارشادِ باری ہے: "اور احسان کرو ماں باپ ...... قریبی پڑوسی اور دُور کے پڑوسی ...... کے ساتھ"۔ (النساء: ۳۶) حضورِ اکرمؐ کا ارشاد ہے: "وہ شخص مؤمن نہیں جس کا ہمسایہ اس کے شر سے محفوظ نہیں"۔ (بخاری)۔ "جبرئیل مجھے ہمسایہ کے متعلق اتنا کچھ بار بار کہتا رہا کہ مجھے خیال آنے لگا کہ شاید وہ اسے شریکِ وراثت بنا دے گا"۔ (صحیحین)

(ب) ہدیہ بھیجنا: حضورؐ کا ارشاد ہے: "جب تم گوشت خریدو یا کوئی اور چیز پکاؤ تو شوربہ زیادہ رکھو تاکہ کچھ ہمسایہ کو بھی بھیج سکو"۔ (بخاری)

(ج) عزّت و احترام: رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے"۔ (بخاری)۔ "اسے ایذا نہ دے"۔ (ایضاً)

(د) پڑوسی کے لئے پیار: حضورؐ کا ارشاد ہے: "تم میں سے کوئی شخص ایماندار ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ اپنے پڑوسی کی جان کے لئے وہی پیار نہ رکھے جو خود اپنی جان کے لئے پیار رکھتا ہے"۔ (مسلم)

(ہ) پڑوسی کی ضرورتوں کا خیال: ارشادِ نبویؐ ہے: "وہ مومن نہیں جو خود تو شکم سیر ہو کر کھائے اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا سوئے"۔ (بیہقی و ادب المفرد)

(و) پڑوسی کے ساتھ بُرائی کی شناعت: حضورؐ کا فرمان ہے: "زنا حرام ہے' خدا اور اس کے رسولؐ نے اسے حرام کیا ہے' لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے۔ چوری حرام ہے' خدا اور رسولؐ نے اس

کو حرام کیا ہے، لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرا لے"۔ (ادب المفرد)

(ز) مجموعی حکم: حضورؐ کا ارشاد ہے کہ پڑوسی اگر تمہاری اعانت کا طالب ہو تو اس کا ہاتھ بٹاؤ، اگر تم سے قرض مانگے تو اسے قرض دو، اگر وہ محتاج ہو تو اس کی مالی امداد کرو، اگر بیمار ہو تو اس کی تیمارداری کرو، اگر مرجائے تو اس کے کفن دفن میں شرکت کرو، اگر اسے بھلائی پہنچے تو اسے مبارکباد دو، اگر مصیبت میں گھرا ہو تو اظہارِ ہمدردی کرو، اگر مکان پڑوسی کے مکان سے اونچا کرنا چاہو تو اس کی رضامندی پہلے حاصل کرو، اگر کھانے پینے کی چیزیں (بالخصوص پھل) لاؤ تو اسے بھی بھیجو، ورنہ رازداری قائم رکھو۔ اسے کسی بھی قسم کی ایذا سے محفوظ رکھو۔[۲۲]

(۹) مسافروں اور مہمانوں[۲۳] کے حقوق:

(ا) نیک سلوک: خدا تعالیٰ فرماتے ہیں: ...... **وَابْنِ السَّبِيلِ** (النساء: ۳۶) "اور مسافر کے ساتھ نیک سلوک کرو"۔

(ب) مالی امداد: مال غنیمت میں مسافروں کا حصہ رکھا گیا ہے: **وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ .... وَابْنِ السَّبِيْلِ** (الانفال: ۴۱) "اور جان لو کہ جو چیز تم فتح پا کر حاصل کرو اس کا ...... مسافروں کے لئے (حصہ ہے)"۔

(ج) تکریم و تعظیم: حضورؐ کریم کا ارشاد ہے کہ "جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان لایا اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے"۔ (بخاری)

(د) مہمان کی مشایعت: حضورؐ ختم المرسلت نے فرمایا: "سنّت میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی (میزبان) اپنے مہمان کے ساتھ اس کی تعظیم کے لئے گھر کے دروازے تک جائے"۔

---

[۲۲] بحوالہ غیرفانی تہذیب۔ حقوق العباد۔ الترغیب و الترہیب۔ اس میں پڑوسی کا ایک اور حق یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اپنے باورچی خانہ کے دھوئیں سے اسے رنج نہ دو۔

[۲۳] حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان داری اور مہمان کے حقوق کا مجملا تذکرہ سورۃ الذاریات (آیہ ۲۴ تا ۲۸) میں ہوا ہے۔ علماء نے اس حکایت سے مہمان کے متعدد حقوق ثابت کئے ہیں۔ (دیکھئے فقہ القرآن، جلد سوم)

(ابنِ ماجہ ' بیہقی)

(ہ) **ایثار:** قرآن مجید میں آتا ہے کہ "(مسلمان مہمانوں یعنی مہاجروں کو) اپنے سے مقدّم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو"۔ (الحشر: ۹)۔ حضورؐ کا فرمان ہے کہ "(مؤمن کو چاہیے) اپنے مہمان کی عزت کرے اور اس کے ساتھ خاطرمدارات کی مدّت ایک دن رات ہے"۔ (صحیحین)

(۱۰) میزبانوں کے حقوق:

(ا) **بے اجازت گھر میں نہ جانا:** ارشاد الٰہی ہے: "اے مومنو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھے بغیر اور ان پر سلام بھیجے بغیر نہ داخل ہوا کرو"۔ (النور: ۲۷)

(ب) **دسترخوان سے کھائے پیئے بغیر اٹھنے کی ممانعت:** حضورؐ کا ارشاد ہے: "جب دسترخوان بچھا دیا جائے تو کوئی شخص نہ اٹھے حتّٰی کہ دسترخوان نہ اٹھا لیا جائے"۔ (ابنِ ماجہ)

(ج) **میزبان کے لئے دعائے خیر:** حضورؐ ایک انصاری کے ہاں مہمان ہوئے' طعام کے بعد آپؐ نے ایک چٹائی پر نماز پڑھی اور ان (گھر والوں) کے لئے دعا مانگی۔ (بخاری)

(د) **تین دن مدّتِ قیام:** حضورؐ سیّدِ وُلدِ آدمؑ کا ارشاد ہے: "(ضیافت) ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے۔ اس سے آگے (میزبان کی طرف سے) مہمان پر صدقہ ہوگا"۔ (بخاری)

(ہ) **مہمان کا میزبان کو اپنے ساتھیوں کے بارے میں مطلع کرنا:** ایک دفعہ حضورؐ ایک دعوت میں تشریف لے گئے۔ راستے میں ایک شخص آپ کا ہم جلیس ہوا تو آپؐ نے میزبان کو بتا کر اس کے ساتھ آنے کی اجازت لی۔ (بخاری)

(و) **ہدیہ پیش کرنا:** حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا ارشاد ہے کہ "ایک دوسرے کو (مہمان میزبان کو اور میزبان جواباً کچھ) تحائف دیا کرو' اس سے کدورت ختم ہو جاتی ہے"۔ (ترمذی)

(جاری ہے)

تعارف و تبصرہ

محمد سعید الرحمن علوی

نام کتاب: ذکر خیر
مولف: خواجہ محمد محبوب عالم شاہ صاحبؒ
ناشر: صاحبزادہ محمد مشیر عالم شاہ صاحب۔
محبوب توکلی دواخانہ۔ صدر بازار' منصور آباد' فیصل آباد

شخصی اور سوانحی تذکرے ہمارے تاریخی ادب کا اہم حصہ ہیں اور اس حوالے سے آج دنیا کی ہر علمی زبان میں ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ اس ضمن میں ان حضرات کے تذکرے سب سے بڑھ کر مقبول و معروف ہوتے ہیں جن میں اللہ تعالی کے کسی صاحب دل و درد بندے کا تذکرہ ہوتا ہے اور اس کی شخصی زندگی اور کارنامہ ہائے حیات کی تفصیلات مندرج ہوتی ہیں ۔ ایسے بندگان بے غرض اور بلا نوشان محبت کا عجیب حال ہوتا ہے۔ ان کا مرنا جینا اور ان کا ہر عمل اللہ تعالی کی رضا کے لئے ہوتا ہے اور ان کے نفس کی گرمی سینکڑوں نہیں ہزاروں کو سچائی کی راہ دکھلانے کا سبب بنتی ہے۔

ایسے ہی قابل احترام بندوں میں مشرقی پنجاب کے معروف شہر انبالہ کے ایک بزرگ تھے' نام تھا خواجہ توکل شاہ صاحب۔ نقشبندی سلسلہ کے وہ معروف شیخ طریقت تھے۔ طریقت کے چار معروف سلاسل میں سے اس سلسلہ کی نسبت یاران طریقت حضرت الامام جانشین رسول' سیدنا و مقتدانا ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ کی طرف کرتے ہیں۔ برعظیم میں اس سلسلہ کا نقطۂ عروج حضرت الامام مجدد الف ثانی قدس سرہ کی ذات گرامی ہے جو مشرقی پنجاب کی بستی سرہند کے رہنے والے تھے اور جنہوں نے گمراہ کن عقائد و نظریات کے سامنے اس طرح بند باندھا کہ وقت کی حکومت بھی گھٹنے ٹیک کر رہ گئی --- حضرت مجدد کی ذات گرامی کو ہمارے فلسفی شاعر اقبال نے بڑا زبردست خراج عقیدت پیش کیا و ران کی خدمات پر مختلف اصحاب قلم نے عظیم کتابیں لکھیں۔ مجدد صاحب کے بعد یہ سلسلہ ان کی گرمی نفس سے جنوبی ایشیا کے ساتھ ساتھ تمام پڑوسی ممالک ' روسی ریاستوں اور مشرق وسطی میں دور تک پھیلا اور اس حلقہ کی خانقاہوں نے معاشرے کی اعتقادی اور فکری اصلاح کے لئے بے حد کام کیا' ساتھ ہی عوام میں جذبہ عمل کی بیداری اور جہاد حریت کے لئے بھرپور طریق سے جذبات پیدا کئے۔

حضرت سید توکل شاہ صاحب ایک ایسے ہی بزرگ تھے جن سے بڑے لوگوں نے استفادہ کیا اور تزکیہ نفس کی سعادت حاصل کی۔ وہ اسم بامسمی بزرگ تھے اور ان کی تعلیم کے بنیادی نکات آخرت کے لئے تیاری اور دنیا کی مذمت ہوتے۔ ان کے خادم و عقیدت کیش اور ان کے پیغام محبت کے داعی خواجہ محمد محبوب عالم شاہ صاحب نے ان کا تذکرہ بڑی محبت و اخلاص سے مرتب کیا ہے جو بارہا اشاعت پذیر ہوا، جبکہ اب ایک عرصے سے وہ نایاب تھا۔ مقام مسرت ہے کہ صاحب تالیف کے فرزند نے اس مجموعہ کو حسن و خوبی سے پھر چھاپ دیا ہے۔

نام کتاب: صدائے محراب
خطیب: صاحبزادہ طارق محمود
قیمت: ایک صد پچاس روپے صرف
ملنے کا پتہ: مکتبہ "لولاک" جامع مسجد محمود۔ ریلوے کالونی فیصل آباد

"خطابت" نام ہے اپنے مافی الضمیر کو دوسروں کے سامنے ظاہر و بیان کرنے کا اور ان تک اپنے پیغام کو پہنچانے کا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی نے جتنے نبی اس دنیا میں بھیجے وہ اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ خطابت کے کمال سے بھی پوری طرح متصف تھے اور حضور خاتم النبیین و المعصومین صلی اللہ تعالی علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم تو اپنے دور کے اتنے بڑے خطیب تھے کہ بڑے سے بڑے لوگ آپ کے سامنے کودن نظر آتے۔ آپؐ کو سیرت کی کتابوں میں سید الخطباء اور امام الخطباء کے گرامی قدر القابات سے یاد کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح آپؐ ہر معاملہ میں اور ہر خوبی میں سب سے بڑھ کر تھے، اس خوبی و صفت میں بھی سب سے اعلی اور سب سے برتر تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کا تو اپنے متعلق یہ ارشاد ہے کہ قیامت کے دن جب ساری دنیا مہربہ لب ہوگی اس وقت بھی آپؐ کی صفت خطابت کا خوب سے خوب تر ظہور ہوگا۔

حضور گرامی مرتبت کے بعد آپؐ کی امت میں ہر دور اور ہر زمانہ میں بڑے بڑے خطیب پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی خطابت سے بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ دور آخر میں جنوبی ایشیا میں ویسے تو ہر طبقہ اور ہر جماعت میں بڑے بڑے خطباء پیدا ہوئے لیکن مجلس احرار اسلام ایک ایسی جماعت تھی جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کے رہنماؤں سے لے کر عام کارکنوں تک میں یہ خوبی نمایاں طور پر موجود تھی۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری خطابت کے اس قافلہ کے سرخیل تھے تو ان کے قافلہ کے رفقاء میں ایک معتبر نام مولانا تاج محمود کا تھا جو اصلا ہزارہ کے باسی تھے لیکن انہوں نے ساری زندگی فیصل آباد میں گزاری اور

اسی شہر میں چند برس قبل ان کا انتقال ہوا ---- اپنے قافلہ کے دوسرے افراد کی طرح ان کا بھی خطابت میں ایک امتیازی مقام تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی جامع مسجد محمود میں کچھ عرصہ تو مختلف حضرات جمعہ کا خطبہ دیتے رہے' پھر مولانا کے بعض عزیز دوستوں کے کہنے سے ان کے اکلوتے فرزند برادرم طارق محمود نے اس منصب کو سنبھالا اور "**الولد سر لابیہ**" کے مصداق جلد ہی ثابت کر دیا کہ وہ اپنے والد کے صحیح جانشین ہیں ۔ انہوں نے اپنی مسجد میں موقعہ و محل کی مناسبت سے خطبات جمعہ دئے اور اس کے لئے قرآن و حدیث کے ساتھ اسلاف کے علمی ورثہ سے بھرپور استفادہ کیا۔ ساتھ ہی فیصل آباد کے بعض گرامی قدر علماء اور اساتذہ کی رہنمائی حاصل کی اور پھر ایسے ہی بعض مہربانوں کی خواہش پر ان خطبات کو بہت ہی مناسب ترتیب سے مرتب کر کے چھاپ دیا۔

اس مجموعہ کا ابتدائیہ بزرگ عالم مولانا خان محمد نقشبندی کے قلم سے ہے۔ اس مجموعہ کے صفحات ۶۱۶ ہیں تو اس میں ۵۳ خطبات ہیں جن کی تیاری کے لئے موصوف نے قرآن و حدیث کے علاوہ ایک سو سے زائد ضخیم و مختصر کتابوں سے استفادہ کیا۔ معلومات سے پر یہ خطبات نوآموز خطباء کے ساتھ عام لوگوں کے لئے بڑے مفید ہیں۔ اللہ تعالی اس مجموعہ کو تمام قارئین کے لئے مفید بنائے۔

بقیہ : لغات واعراب قرآن

ترجمہ ہوگا : "کچھ وقت کے لیے ' کچھ مدت کے لیے یعنی کچھ عرصے تک " وغیرہ ۔ یہ لفظ (حین) قرآن کریم میں ۳۴ بار استعمال ہوا ہے ۔ (یعنی مختلف تراکیب میں) اور قرآن کریم میں اس لفظ کے علاوہ اس مادہ سے اور کوئی لفظ (اسم یا فعل) استعمال نہیں ہوا ۔ ویسے عام عربی میں اس سے مجرد اور مزید فیہ کے متعدد افعال مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں جو کسی ڈکشنری میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔

(جاری ہے)

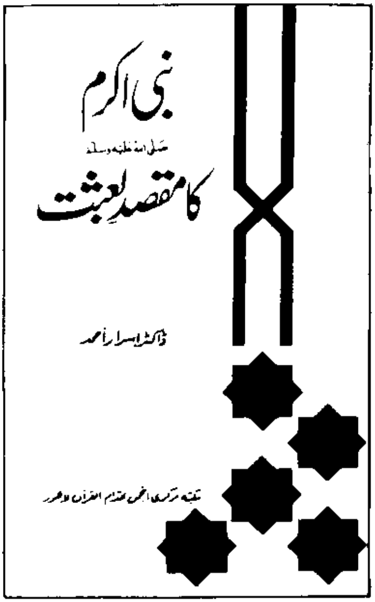

نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم

کا مقصدِ بعثت

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

اشاعتِ خاص -/۲۰ روپے، عام -/۶ روپے

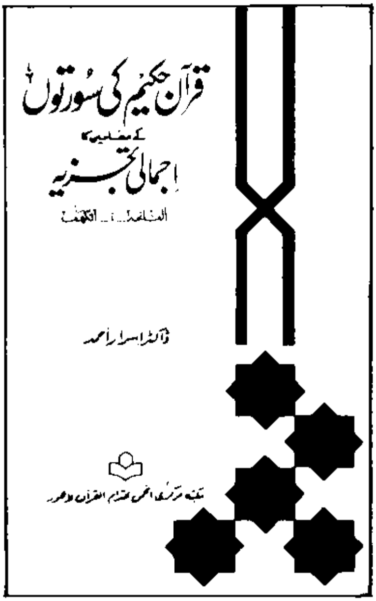

قرآن حکیم کی سورتوں

کے مضامین کا

اجمالی تجزیہ

الفاتحہ تا الکہف

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

اشاعتِ خاص -/۴۰ روپے، عام -/۲۰ روپے

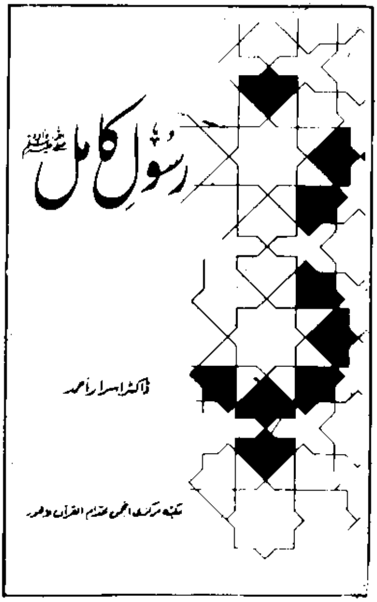

رسولِ کامل ﷺ

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

اشاعتِ خاص -/۱۲ روپے، عام -/۵ روپے

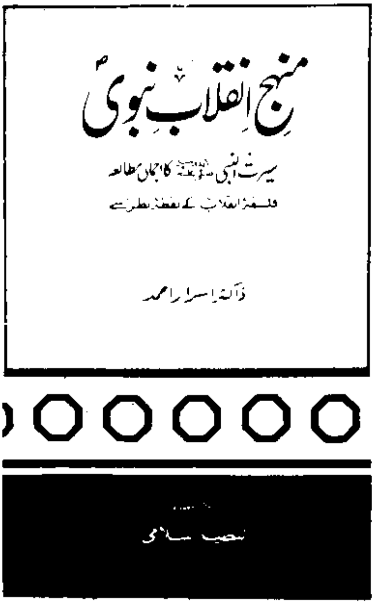

منہجِ انقلابِ نبویؐ

سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے

ڈاکٹر اسرار احمد

اشاعتِ خاص -/۶۰ روپے، عام -/۳۰ روپے

OCT. 1992
Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE
VOL. 11
NO. 10

ماہنامہ میثاق لاہور
کی اشاعتِ خصوصی۔ بابت اکتوبر ۱۹۹۲ء

مضامین کی جھلک

● جماعتِ اسلامی کی تاریخ کا تیسرا اور شدید ترین بحران
● پس منظر ● تجزیہ ● تبصرہ ——— اور ● مشورے

● اسلام اور پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش
اس میں مذہبی جماعتوں کا کردار اور اس کا متوقع نتیجہ!

● مولانا مودودی مرحوم اور میں

تمام تحریریں ازقلم
ڈاکٹر اسرار احمد
امیر تنظیمِ اسلامی

● صفحات ۱۲۸ ● اس شمارے کی قیمت -/۱۰ (سالانہ زرتعاون -/۵۰)
منگوانے کے پتے (i) مرکز تنظیمِ اسلامی، ۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ۔ گڑھی شاہو لاہور
(ii) مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور